©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | جے این یو: کمرہ نمبر۔259 |
| مصنف وناشر | : | عمران عاکف خان |
| مصنف کا پتہ | : | **Fiction Numa, Vasant Kunj, New Delhi - 110067 Mobile: 9911657591 Email: imranakifkhan@gmail.com** |
| سن اشاعت | : | 2018 |
| تعداد | : | 500 |
| صفحات | : | 180 |
| قیمت | : | 250/- |
| زیر اہتمام | : | دائی پرواز ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، لکھنؤ |


مصنف/پبلشر کی اجازت کے بغیر اس کتاب کا کوئی حصہ، آڈیو، ویڈیو، فوٹو کاپی، ریکارڈنگ کے ذریعے شائع/استعمال نہ کیا جائے۔ اسی طرح اس میں شامل تمام مواد اور مشمولات کے لیے مصنف/پبلشر ذمے دار ہے۔

JNU Kamra No-259
**By: Imran Akif Khan**
**Ist Edition: 2018 Pages: 180 Price: Rs. 250/-**

www.urduchannel.in

# جے این یو

## کمرہ نمبر 259

عمران عاکف خان

✸

نجیب احمد کے نام
جس کا سراغ اب تک سی بی آئی بھی
نہیں لگا سکی ــــــ!

www.urduchannel.in



”جے این یو صرف ایک تعلیم گاہ نہیں ہے بلکہ یہ ملک و قوم کے ایوان کاایک ایسا ستون ہے جس سے جمہوریت،انسانیت،ملکی اتحاد،تعمیر وترقی اور مضبوطی کے خواب جڑے ہیں.اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اس کی بنیادوں اور مقاصد سے کھلواڑ کرے گا وہ راست ملک کی رگ و جاں سے کھیلے گا.حالاں کہ ملک میں متعدد اعلا تعلیم کے ادارے موجود ہیں مگر جے این یو ان سب سے الگ، اس فکر کا نام ہے جسے اگر میں ملک کی روح کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا.مختصر یہ کہ جے این یو ایک دانش گاہ نہیں بلکہ ایک نظریے کا نام ہے.“

**پنڈت جواہر لال نہرو۔1963**

# (1)

معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا——

تھرڈ فلور کی بالکنی سے سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سابرمتی ڈھابے کے پاس پولیس والے کافی بڑی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور امرجنسی شیلڈس [Shields] تھے۔ پولیس والوں کے ساتھ اے بی وی پی کے کچھ نوجوان بھی تھے۔ میرے [محمد انیس کے] لیے ان نوجوانوں کو شناخت کرنا ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ جے این یو آئے ہوئے مجھے تین برس گزر چکے تھے۔ ان تین برسوں میں جے این یو کی زندگی کا ہر صفحہ میرے سامنے تھا، یہاں کی شامیں، یہاں کی صبحیں، یہاں کے دن، یہاں کی راتیں، یہاں کی بہاریں، یہاں کی خزائیں، میں سب سے اچھی طرح آشنا ہو چکا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ سب سے زیادہ جے این یو کی سیاست کے صفحات میرے سامنے تھے۔ یہاں کی کلین اور ڈرٹی پالیٹکس کے بارے میں، میں خوب جان چکا تھا۔ یہ دو طرح کی سیاستیں مجھے ہر قدم پر حیران کر رہی تھیں۔ یہ تو ایک رہی، دوسری یہ کہ میرے لیے یہ سوچ پانا بھی مشکل تھا کہ کوئی وائس چانسلر جے این یو جیسے عظیم الشان اور مکمل تعلیمی کیمپس میں ٹینک رکھنے کی بات بھی کہہ سکتا ہے۔ معاً یہ سوالات بھی ذہن میں کوند رہے تھے کہ کیا کوئی تعلیمی ادارہ فوجی بیرک اور آرمی کی ٹریننگ کیمپ بھی ہوسکتا ہے؟ سخت بوٹ وہاں کے تعلیمی

www.urduchannel.in



مشن کو کیسے کچل سکتے ہیں؟ اور سولجرس کے لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کے ترانے، کیوں کر اس کے پرسکون ماحول میں سمع خراشی پیدا کر سکتے ہیں؟ جہاں ملکی تعمیر اور دوردراز کے اندھیرے میں ڈوبے علاقوں کو روشن کرنے کے لیے پوزیٹیو کوششیں ہو رہی ہوں۔ یہ وہ جے این یو نہیں تھا جس کے بارے میں سوچتے ہوئے اور مسلسل خواب دیکھتے ہوئے میں میوات کے گھنے جنگلوں سے باہر نکل کر دلّی کے شور بھرے جنگل میں آ گیا تھا۔

دلّی—— میوات میں اپنے دوستوں سے باتیں کرتے ہوئے اکثر اس شہر کا مذاق اڑاتا تھا۔ دوستوں کی محفل میں مجھے ہنسی آتی تھی، یہ اسی دلّی کی باتیں ہوتی تھیں جس کا بار بار گینگ ریپ ہوا ہے، تاریخ کے صفحات چیخ چیخ کر یہ بتاتے رہے ہیں کہ ہزاروں برسوں کے سفر میں دلّی بار بار لٹتی رہی ہے برباد ہوتی رہی ہے۔ کبھی ترکوں نے، غوریوں نے اسے برباد کیا، کبھی منگولوں نے، مغلوں نے اسے لوٹا اور اب تو بھگوا تہذیب کہتی ہے کہ ہزار برسوں کے سفر میں دلّی کی ہر لوٹ کے پیچھے مسلمان ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے بھارت ماتا کے ٹکڑے کر دیے، انھوں نے ہماری ماتا کو کبھی ناختم ہونے والی تکلیف دے دی۔ یہ ہماری عقیدتوں کو پامال کرتے ہیں اور ہماری آستھاؤں کو ہم سے چھینتے ہیں۔ ہماری عبادت گاہیں ان کے راجاؤں اور بادشاہوں نے توڑ کر مسجد بنا دیں۔ میں ان حالات میں کبھی کبھی گہری سوچ میں پڑ جاتا ہوں۔ عجیب سا خوف میرے رگ و پے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ ہم کس دنیا میں آ گئے؟ کہاں آ گئے ہیں؟ 21ویں صدی میں بھی یہ ہمارے سامنے کیسا ہندوستان پروسا جا رہا ہے؟ یہ سوالات ابھی اور آگے کا سفر طے کرتے ہیں کہ—— سناٹے میں دھماکے اور دل خراش چیخوں کی آواز ابھرتی ہے اور پھر تیز تیز سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ فلسطین، چیچنیا، شام، افغانستان، عراق، روہنگیا اور پاکستان و بنگلہ دیش سے باہر نکلیے تو کشمیری نوجوانوں کی سسکیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ان کا قتل، ان کا

ریپ، ان کاانکاؤنٹر، یہ سب آئے دن کی باتیں ہیں۔ ہم بار بار کاسگنج، مظفرنگر، ہریانہ، الور، جھارکھنڈ اور بہار کے نام پر شہید ہی تو ہوتے رہے ہیں۔ کبھی یہاں آنر کلنگ، کبھی یہاں ماب لنچنگ، کبھی گینگ ریپ، کبھی دنگا، کبھی فساد!! میں بہت سارے واقعات کا گواہ رہا ہوں لیکن جے این یو آتے ہوئے یقین نہیں تھا کہ ملک بھر میں لگنے والی اس آگ کے دھوئیں یہاں بھی پہنچیں گے اور ملک کی تبدیلی کا رنگ جے این یو پر بھی اس طرح غالب آئے گا کہ چاروں طرف سے بھگوا آوازوں کے شور مجھے پاگل کر دیں گے۔ جے این یو جیسے سیکولرزم کی علامت ادارے کے کیمپس میں بھی انسانیت کا خون کر دیا جائے گا، اس کی دیواریں بھی نفرت کے نعروں سے بھر دی جائیں گی اور امن کے اس فرشتے کو دہشت گرد کہہ کر مار دیا جائے گا جس کا کام، فروغ امن کے سوا کچھ اور نہیں۔

○○○

باہر سے زور زور سے بولنے اور نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں جو بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ملک کے خلاف جنگ چھڑنے والی ہے او رسولجرس تیز دھنوں میں جنگی ترانے گا رہے ہیں اور دشمنوں پر ٹوٹ پڑنے والے ہوں۔

میں بالکنی سے بوجھل قدموں اپنے کمرے میں آیا تو نوین اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا کتاب پڑھنے میں منہمک تھا۔ آہٹ سن کر وہ میری طرف پلٹا۔ کچھ دیر تک پریشان پریشان آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا:

''—— باہر اب بھی پولیس ہے؟''

''—— ہاں!''

''—— اے بی وی پی کے لوگ چلے گئے یا....''

میں طنز سے مسکرایا ——

www.urduchannel.in



''—— تمھیں سنائی نہیں دے رہا ہے یہ شور؟ ''وندے وندے ماترم'' کے نعرے کون لگا رہا ہے۔ یہ بھارت ماتا کا جے کارا کون کر رہا ہے——؟''

''—— نوین وہ بھی تو پولیس کے ہی آدمی ہیں، پولیس اسی ذہنیت کی ہے وہ ان سے نہیں لڑے گی۔ پولیس اے بی وی پی کے غنڈوں کو پروٹیکشن دیتی ہے، انھیں کوآپریٹ کرتی ہے، انھیں مہمان بناتی ہے۔ یہاں کی انتظامیہ بھی اے بی وی پی والوں سے پنگا نہیں لے سکتی بلکہ کئی فرمان تو اس نے اس کی خواہش پر ہی جاری کیے ہیں۔ اب جے این یو کے اہم فیصلے اے بی وی پی کے ابرو کے اشاروں پر ہوتے ہیں۔''

اچانک میں نوین کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے چیخا——

''—— پولیس کو پنگا لینا ہے تو وہ مجھ سے یا تم سے لے گی، ہماری پیٹھوں اور شانوں پر ہی اس کے ڈنڈے چلیں گے، ہمارے ہی پہلوؤں پر وہ لات گھونسے برسائے گی، جو اس نئی تہذیب میں کہیں شامل نہیں ہیں، جو بھگوائیت سے نفرت کرتے ہیں اور اے بی وی پی و موجودہ حکومت کی بالادستی تسلیم نہیں کرتے۔ تمھیں یاد ہے نا، نوین! جب جے این یو پر سب سے برے دن آئے تھے اور جے این یو کو ''دیش دروہیوں'' کا گڑھ کہہ دیا گیا تھا، اس وقت پولیس کیسے کیسے ہاسٹلوں کے چپے چپے، کونے کونے چھان مار رہی تھی۔ میڈیا کس طرح جے این یو کی کردار کشی کر رہا تھا اور ایک خاص طبقے کی منہ بھرائی کے لیے اس کے تقدس کو گالیاں دے رہا تھا۔ اس کی مہم نے جے این یو کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا جس کے حصے داروں کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ جے این یو کو ڈائنامائٹ سے اڑا کر اس کا قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔''

''—— تمھیں یہ بھی یاد ہوگا کہ وہیں ماہی مانڈوی ہاسٹل کے چوک کے پاس نجیب کی

ایک چپل پڑی تھی۔ جب نجیب کی ماں، بھائی اور بہن صدف، نجیب پر بیتی سن کر آئے، تب بھی وہ وہیں پڑی تھی۔ وہ زبان حال سے اس مظلوم پر گزری انہونیاں اور تشدد کی داستاں بیان کر رہی تھی۔ خون میں لت پت وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے بے رحمی سے کسی کبوتر کی گردن پر بلیڈ چلا کر چھوڑ دیا گیا ہو اور اس سے خون رِس رِس کر اس کے پورے وجود پر سوکھ گیا ہو۔''

نوین نے کتاب رکھ دی اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا..... پھر وہ بڑبڑانے لگا۔

''—— یہاں سب نجیب ہیں۔ ہم سب بھگوا جھنڈا بردا روں کے نشانے پر ہیں۔ جے این یو ان کے نرغے میں آچکا ہے۔ اب یہ دو خانوں میں بٹ چکا ہے۔ ایک گروہ بھگوا جھنڈا لہراتا ہے اور دوسرا ترنگا لہراتا ہے۔ جو ترنگا لہراتے ہیں میڈیا اس ترنگے کو بھی اسلامک پرچم بنا دیتا ہے یا ایک خاص چال بازی سمجھتا ہے—'' اس نے ایک گندی سی گالی بکی:

''—— مادر..... ہم سب نجیب ہی ہیں۔ جو یہاں پڑھنے کے لیے نہیں جے این یو کے جنگلوں میں کھو جانے کے لیے آئے ہیں۔ تمھیں یاد ہے نا انیس! اکثر جے این یو کے جنگلوں سے کوئی لاش برآمد ہو جاتی ہے۔ وہ ہم میں سے ہی تو کسی کی ہوتی ہے۔ کبھی کوئی اپنے کمرے میں مرا مل جاتا ہے، اسے بھی ایسے حالات ہی خودکشی پر مجبور کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ایک پورے گلے سڑے سسٹم نے ہمیں بھی سرد لاش میں تبدیل کر دیا ہے، پتا نہیں ہم مرے ہوئے ہیں یا زندہ، سانسیں چل رہی ہیں تو کیوں اور مرے ہیں تو، ہماری موت سے کس کو فائدہ ہے۔'' نوین کہتا جا رہا تھا.....

جے این یو کے اس ماحول نے مجھے پریشان کر دیا۔ مجھے پل پل عدم تحفظ کا احساس ہوتا ان حالات میں، میں نے میوات واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے اٹل ارادے دیکھ

www.urduchannel.in



کر نوین نے گہرا سانس چھوڑتے ہوئے آہستہ سے کہا:

''—— سوچ لو! میں پھر کہتا ہوں، جانے کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ میوات گئے تو یہاں کی آگ میوات بھی پہنچ سکتی ہے۔ تم جانتے ہو نا، 9 فروری کے جلوس میں تم بھی تھے اور اب یہاں پولیس والے باقاعدہ ایسے تمام جلوس کی ویڈیو کلپس / فوٹیج رکھتے ہیں اور پھر ایک دن ان ویڈیو کلپس / فوٹیج میں سے کچھ لوگوں کو باہر نکال کر میڈیا انھیں دیش کا سب سے بڑا ولین بنا دے گا۔ یعنی غدار— پولیس تمھیں وہاں بھی نہیں چھوڑے گی بلکہ اس آگ میں تمھارے ساتھ تمھارا پورا خاندان جلے گا، تمھاری پوری تاریخ جلے گی، تمھاری پوری عزت، آبرو جلے گی، تمھارا وقار جلے گا، تمھارا احساس جلے گا.....''

نوین بولتا جا رہا تھا اور میری آنکھوں کے آگے گہرے سائے منڈلا رہے تھے۔ میں ایک دم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میوات مجھے آواز دے رہا تھا مگر اب میرے اندر اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ میں کرسی سے اٹھ کر دو قدم بھی آگے چل سکوں۔ ذہن میں مسلسل دھماکے ہو رہے تھے۔

○○○

# (2)

## خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی——

**میوات :——**

میں جے این یو سے، میوات جانا چاہتا تھا، میوات جس کی کہانی نارتھ ایسٹ، یا ہندوستان کے کسی دور دراز علاقے کی داستان جیسی ہے۔ جے این یو کے پورے سال ہرے بھرے اور سرخ پھولوں سے سجے رنگ روڈ پر گھومتے ہوئے ایک دن نوین نے مجھ سے میوات کی کہانی سنانے کے لیے کہا تھا۔ میں نے اسے میوات کی جو کہانی سنائی، اس کے لیے اس کی دل چسپی اور شوق میرے سینے میں موجود، رازوں کو نکالتا چلا گیا۔

''—— فرنگی اقتدار سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کے حصے میں آنے والے علاقوں میں ایک علاقہ ایسا بھی ہے جو آبادی اور رقبے کے اعتبار سے اقوامِ متحدہ کے کئی ممبر ممالک سے بڑا ہے اور جہاں مسلمانوں کی بہت واضح اکثریت بستی ہے۔ اس علاقے کی زیادہ تر زمینیں بھی مسلمانوں کی ملکیت ہیں جن میں وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں، انھیں بیچتے ہیں اور اپنی نسلوں کو میراث (حصے) میں دیتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کا آج تک بھی اسی طرح زور واثر ہے، جیسے کبھی گئے وقتوں میں پورے ہندوستان میں تھا۔ اس علاقے

www.urduchannel.in



کا نام ہے میوات اور اس میں آباد مسلم اکثریت میو راجپوتوں کی ہے، یہاں میو بستے ہیں، ان کی ٹوٹی پھوٹی بکھری تہذیب بستی ہے، ان کے احساس اور ان کی معصوم آرزوئیں بستی ہیں۔ اپنی ان ہی خصوصیات کے سبب یہ علاقہ اکثر فسطائی طاقتوں کا نشانہ بھی بنتا ہے۔ میوات کی کہانی کسی ایک شہر کی سی کہانی نہیں ہے بلکہ ڈھائی سو کلومیٹر کے ایریے میں ہزاروں کہانیاں یہاں ہر دن جنم لیتی ہیں اور ہوا کی طرح چاروں طرف پھیلتی چلی جاتی ہیں——''

''—— دلّی سے جانب جنوب مغرب میں اروالی کی پہاڑیوں سے ''کالے پہاڑ''، الور، جے پور، بیراٹھ، جنوب میں ڈیگ، بھرتپور، آگرہ، متھرا، شمال میں فرید آباد کے درمیان واقع خطے کو میوات کہا جاتا ہے۔ ایک میواتی شاعر نے علاقۂ میوات کا تعارف / جغرافیہ اس طرح بیان کیا ہے:

اِت دلّی اُت آگرو، جے پور اور بیراٹھ!
کالو پہاڑ سہناؤنو، جہاں بسے میوات!!

[اِدھر دلّی، اُدھر آگرہ، جے پور اور بیراٹھ۔ کالا پہاڑ جو بہت سہانا ہے اور خوشنما ہے، وہاں میوات واقع ہے]

''—— قدرتی اور کاینناتی عنایات سے محروم محض موسمی / سیزنل بارشوں اور وقتی تبدیلیوں پر منحصر میوات، اپنے زائرین کو ہندوستان کے سرحدی علاقوں کی زیارت کرا دیتا ہے۔ علاقہ میوات، ہریانہ کے تین، راجستھان کے دو اور یوپی کے دو ضلعوں پر مشتمل، دلّی کی طرح ہندوستان کے قلب میں واقع ہے۔''

''—— میوات جتنا معروف ہے اتنا ہی پراسرار بھی ہے۔ یہاں کے قلعوں، گڑھیوں، مداروں (مزاروں) ہدیروں (حضیروں) تکیوں، چھلوں، پہاڑوں، جنگلوں، نہروں، نالوں،

گڑھوں، ڈبروں اور میدانوں میں کتنے ہی راز اور کہانیاں دفن ہیں جو سربستہ ہونے کو بھی بے تاب ہیں اور زمانے سے چھپنے کو بھی۔ میوات پر کبھی ایسے بھی دن گزرے ہیں، جب برصغیر کی تقسیم کے وقت، مہاراجہ آف الور اور مہاراجہ آف بھرت پور کی فوجوں کے گڑگڑاتے بمبار طیاروں اور تڑتڑ کرتی مشین گنوں نے اس کے میدانوں، پہاڑوں، نالوں اور جنگلوں کو، وہاں بسنے والے میوؤں کو انتہائی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا کر ان کے خون سے سیراب دیا تھا۔ میوات ان دنوں کو اب تک نہیں بھولا جب وہی لاشیں پانچ، چھے دن تک چیل کوؤں اور آوارہ کتوں کی خوراک بنیں اور پھر ان کے بچے کھچے حصوں کو ایک بڑے سے گڑھے میں دبا دیا گیا۔ اس وقت نہ ان پر کوئی نوحہ کناں تھا اور نہ کسی نے ان بدقسمتوں پر ماتم کیا۔ آسمان نے بھی نہیں، کائنات نے بھی نہیں۔ سپید و سیاہ بادل بھی ان پر نہ روئے تھے۔''

''—— رازوں اور بھیدوں کی اس سرزمین میوات میں، میو قوم آباد ہے۔ جس کا رہن سہن عام سا ہے۔ مردوں کا پہناوا، کرتا دھوتی، سادہ پنٹ شرٹ۔ عورتوں کا لباس، سوٹ شلوار، سر پر پورے سر کو ڈھانپنے والے دوپٹے پر مشتمل ہوتا ہے، وہ اس دوپٹے کو جسے وہ لوگڑا کہا جاتا ہے، اسے وہاں کی عورتیں اپنے سر سے گھماتے ہوئے حرم پر اس طرح ڈالتی ہیں کہ پاکیزہ حجاب بن جاتا ہے۔ ڈیزائنڈ اور دیدہ زیب گاؤن، سفاری، سلک، پشمینہ، یہاں کسی کو نہیں پتا اور نہ ہی انھیں استعمال کرنے کی حیثیت ہے۔ میوؤں کا کام دھندا، زیادہ تر کھیتی باڑی۔ بھینس پالنا، ان کا بیوپار کرنا، دودھ بیچنا یا دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنا ہے۔ گھر مکان، کچھ پکے، اکثر کچے، ایک منزلہ، دومنزلہ، بعض تو سرکنڈوں کے جھونپڑوں کے بنے ہوئے۔ ملٹی اسٹوری اور بیسمنٹیل لاج، آج بھی میواتیوں کے لیے ایک خواب ہیں۔ سوٹ اور اعلا فرنیچر و آسائشوں سے لیس روم تو ان کے لیے داستانوی

www.urduchannel.in



باتیں ہیں۔ یہاں نشاط گاہیں، پب، کیسل، کسینو، پارکس / گارڈنس، ریس کورس، کوریڈور، کلب پارٹیز کا کوئی تصور نہیں اور شاید آنے والی ساتھ آٹھ نسلیں تک بھی انھیں نہ جان سکیں۔ اس کے باوجود بھی یہاں جو چند افراد مال دار ہیں وہ خوب ہی مال دار ہیں، شہروں میں دوسرے درجے کے علاقوں میں ان کی کوٹھیاں اور بنگلے ہیں، ان کے پاس زمینیں، جائداد، گاڑیاں ہیں اور جو غریب ہیں ان کی غربت انتہائی درجے کی ہے۔ نہ ان کے پاس زمینیں ہیں اور نہ ہی اچھے گھر۔ وہ گاؤں کے باہری حصوں میں جھونپڑے بنا کر زندگانی بسر کرتے ہیں۔''

''—— میوات کی معیشت و تجارت بنیوں کے ہاتھوں میں ہے، قصبات اور شہروں میں ان کی ہی مارکٹیں اور بورڈنگس ہیں، وہ سود و بیاج پر بڑی بڑی رقمیں میوؤں کو دیتے ہیں، جن سے ان کے لین دین، شادی بیاہ، عید بقرعید جیسی اہم تقریبات ادا ہوتی ہیں جب کہ وہ خود صرف سیزنل کھیتی باڑی، پیداوار، یا دودھ کا کاروبار کرتے ہیں۔ ان کے چھوٹے طبقات کپڑوں، پھلوں، مرغی فارم، لوہار گری کا کام کرتے ہیں۔ وہ نوکری اور بڑے کاروبار کو زمانۂ قدیم سے ہی معیوب سمجھتے ہیں۔''

نوین سنتار ہا اور میں کہتا رہا——

''—— میواتی اور برج بھاشا یہاں کی وہ زبانیں ہیں جنھیں یہاں کے ہندو، مسلمان باشندے بے تکلف بولتے ہیں۔ میوؤں کے رسوم و رواج بالکل ہندوانہ اور خیالات بھی وہی ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ میو قدیم آرین اور کشتری قوموں سے تعلق رکھتے ہیں اور ویدوں، پرانوں نیز مہابھارت میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم ایمان و یقین، وعدہ وفائی، مہمان نوازی، زبان و قول اور امانتوں کی ''جان جائے پر، وچن نہ جائے'' کی حد تک حفاظت و پاسداری وہ روایتی انداز میں کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں وہ اپنی قسموں کی لاج

رکھنے کے لیے ''سالار کا جھنڈا'' اٹھاتے تھے۔ بزرگان دین کے حسن سلوک اور ریاضت و عبادت نے انھیں حلقہ بگوش اسلام کیا تاہم ان کی کایا نہ پلٹ سکی چنانچہ وہ خاندان، رشتے داری، شادی بیاہ، رہن سہن، روایات و رسوم توہمات واندھ وشواش میں بالکل وہی ہیں جو اسلام سے پہلے تھے یعنی ہندوانہ افکار ونظریات کے حامل۔ جہیز کا لینا دینا، رواج ورسوم، ان کے پرانے ناموں کے لاحقے ''سنگھ''۔ ''چند''۔ ''مَل''۔ ''راؤ'' اسی طرح پہناوے اور کھانے پینے کے طریقے بھی پرانی روایات کے مطابق ہی ہیں۔ پہلے مرد کھانا کھاتے ہیں، پھر عورتوں کا نمبر آتا ہے۔ مرد بھی الگ الگ وقت میں کھاتے ہیں، یہاں تک کہ کبھی کبھی تو عورتوں کی شام اور رات بھی بغیر کھائے پیے ہی ہوجاتی ہے۔ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں، تہجد گزار بھی ہیں اور بیٹیوں کے حقوق بھی دن دہاڑے مارتے بلکہ ان کی وکالت بھی کرتے ہیں اور پنچ بن کر ان حقوق کی تلفی کے فیصلے بھی سناتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں، اعتکاف میں بھی بیٹھتے ہیں اور سود لینا دینا بھی برا نہیں جانتے، زکوٰۃ بھی دیتے ہیں اور کھیتوں وگہنوں کو بھی رہن رکھتے ہیں۔ حج بھی کرتے ہیں اور چوری ڈکیتی بھی۔ بہنوں، بیٹیوں کو وراثت سے محروم بھی کرتے ہیں اور جہیز بھی لیتے دیتے ہیں۔ ان تمام برائیوں کے باوجود ان کا اسلام محفوظ وباقی رہتا ہے۔ وہ اپنی ان عادتوں سے اس طرح چمٹے ہوئے ہیں کہ کوئی انھیں ہٹا ہی نہیں سکتا۔ اس سلسلے میں، میں تمھیں ایک دل چسپ واقعہ سناؤں گا.....'' میں نے رکتے ہوئے نوین سے کہا۔

''—— ایک مرتبہ ہمارے علاقے میں گجرات کے ایک مولانا آئے۔ انھیں پہلے ہی بتادیا گیا کہ آپ کو صرف دین کی ہی باتیں کرنی ہیں، یہاں کے سماج اور معاشرے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ مگر انھوں نے دوران تقریر، زیادہ وہی باتیں کہیں، اس سے علاقے کے نمبردار اور ان کے حواری بھڑک گئے۔ انھوں نے اپنی لاٹھی اٹھائی زمین پر زور

www.urduchannel.in



سے مارتے ہوئے کہا:

''—— اوے مول صاب [مولانا صاحب] جب تو سو [تم سے] کہہ دی کہ یہ بات نا کرنی ہاں [ہیں] پھر کائیں لو [کیوں] کہہ رو ہے [کہہ رہے ہو]..... نمبردار ٹھوکن مَل نے ایک ایک بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد وہاں بیٹھے سب لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔

''—— جی غلطی ہوگئی چودھری صاب!'' مولانا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''—— اچھو اچھو ٹھیک اے [اچھا اچھا ٹھیک ہے] اب دوبارہ ان باتن نے [باتوں کو] مت کہیو [کہنا] نہیں تو اچھی نہ رہے گی (اچھا نہیں ہوگا)...'' نمبردار یہ باتیں کہہ کر اپنے موڑھے پر بیٹھ گئے۔''

''—— مولانا صاحب کی یہ توہین دیکھ کر وہاں بیٹھے کچھ لوگ اٹھ کر باہر آگئے اور نمبردار کو برا بھلا کہنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ بات پورے علاقے میں پھیل گئی اور اپنے آپ لوگ دو خانوں میں بٹ گئے۔ بس پھر قریب تھا کہ ان میں لڑائی بج جاتی، اسی وقت مولانا صاحب نے ان میں صلح صفائی کرادی اور اسی دن گاؤں چھوڑ دیا۔ مولانا صاحب کے جانے کے بعد علاقہ والے بھائی بھائی تھے۔''

''—— گوتروں، پالوں اور مختلف خانوادوں و برادریوں میں میوات کے بسے مسلمانوں کے احوال انٹرنیٹ کی Dark Web کٹیگری میں رکھے رازوں کی مانند ہیں۔ یہ گوتریں کیوں ہیں؟ یہ خانوادے کس نے بنائے؟ ان پالوں کے بننے کے طریقے کیا ہیں؟ ان کے سردار کیسے بنتے ہیں؟ یہ برادریاں کیسے بنیں؟ ان کا پاگ [طرّے دار پگڑی] سب سے کس کے سر پر باندھی گئی اور کس طرح؟ یہ سوالات آج بھی میوات کے بے آب وگیاہ علاقوں

میں اپنا جواب تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ بوڑھی تائیوں وداد یوں سے پوچھو تو وہ بھی اپنی کسی پانچویں چھٹی پیڑھی کا حوالہ دے کر کہتی ہیں کہ ان کے پاس بھی جواب نہیں تھا۔''

''—— تمھاری گوتر کون سی ہے؟'' نوین نے میری بات ختم ہوتے ہی پوچھا۔

''—— میری گوتر.....'' ھاھاھاھا۔ ''لو اب بات مجھ تک ہی آ گئی....'' میں نے نوین کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔

''—— میری گوتر کا نام پاہٹ ہے یہ گوتر اس علاقے کی تمام گوتوں سے معزز اور خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ اکثر پنچایت میں پاہٹ پنچوں کے ہی فیصلے سنے اور مانے جاتے ہیں اور انھیں گاؤں اور علاقوں میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں تو اس کے لڑکوں کو شہزادہ، صاحبزادہ، سرکار وغیرہ اور ان کی لڑکیوں کو شہزادی، راج کماری، صاحب زادی، بڑی سرکار کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی اجنبی یا مسافر اس گوتر کا حوالہ دے تو اسے وہی تو قیر دی جاتی ہے اور اس کا اسی طرح خیال رکھا جاتا ہے۔ اس گوتر کا نام سنتے ہی بہت سے لوگ احتراماً سر جھکا لیتے ہیں۔ پاہٹ گوتر کے پڑھے لکھے، ہنر مند اور صاحب ثروت افراد کا احترام تو کیا ہی جاتا ہے، ناکارہ اور بے ہنر بھی معزز سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں میں کسی فخر یا بڑائی کے جذبے سے نہیں کہہ رہا ہوں، اس لیے کہ میں تو ان گوتروں اور خاندانوں کی فخر ومباہات کو مانتا بھی نہیں.....

''—— میں گوتروں کو صرف پہچان اور شناخت کا ہی ٹائٹل مانتا ہوں اس کے علاوہ کچھ اور نہیں، اس لیے کہ سب انسان برابر ہیں اور کسی کو کسی پر کوئی خصوصی افضلیت حاصل نہیں ہے۔ اگر ہیں تو سب انسان افضل اور نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ مگر میوات میں ان خیالات و فلسفوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہاں گوتروں کے اثرات و برتری، ایمان کی مانند ذہنوں اور سینوں میں بسائی جاتی ہے بلکہ اسے گھٹی میں پلایا جاتا ہے۔ بچپن سے ہی اپنی

www.urduchannel.in



اپنی گوتر کے بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ فلاں گوتر نیچ ہے، فلاں ہم سے اتنے درجے اونچی ہے، فلاں گوتر کے لوگوں سے بات چیت واسطہ نہیں رکھنا ہے۔ ان کی گوتر میں فلاں عورت نے یہ کیا، فلاں گوتر کے اجداد اس طرح کی حرکات کرتے تھے وغیرہ۔ مجھے یہ بھی سب کچھ بتایا گیا مگر میں روز اول سے ہی ان کی مخالفت کرنے لگا۔''

''—— ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے ایک پنچایت میں گوتروں کی مخالفت کر دی تو وہاں موجود چودھریوں، علاقے کے نمبرداروں اور بڑے بوڑھوں کے تیور بدل گئے۔ وہ سب ایک ساتھ مجھ سے کہنے لگے:

''—— اوئے تو پڑھ لکھ کے اپنے آپ اے کہا سمجھے اے!!'' [تُو پڑھ لکھ کے خود کو کیا سمجھتا ہے!]

''تاؤ میرو [میرا] مطلب تو....''

''—— ہاں! پتواے تیرو [پتا ہے تیرا] مطلب! بس بس!! چپ نہ رہ سکے تُو...'' انھوں نے آنکھیں نکالیں، غصہ سے ان کے بدن لرز رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر وہاں موجود ایک لڑکا فرید گلاس میں پانی لایا اور نمبردار کو پہلے تو مونڈھے پر بٹھایا پھر بڑے ادب سے پانی پیش کیا۔ میں اس طرح سہما ہوا کھڑا تھا جیسے میں کوئی بہت بڑا جرم کر دیا ہو اور اب عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہوں۔ وہ عدالت ہی تو تھی۔ گاؤں کا جرگہ، گاؤں کی عدالت....گاؤں کی پنچایت!!

''—— اور....!'' نمبر دار نے پہلا گلاس غٹا غٹ ختم کر کے منہ صافے سے پونچھتے ہوئے کہا اور فرید دوڑ گیا۔ وہ دوسرا گلاس لایا اور نمبردار اسے بھی پی گئے۔

''یہ پڑھا لکھا جنے اپنے آپ اے کہا سمجھیں اے ان سو کہہ دو کہ ہمارا پرکھان کی چلائی

ریت کا بارا میں کچھ بولنا کی ضرورت نا اے!''[یہ پڑھے لکھے جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں، ان سے کہہ دو کہ ہمارے پرکھوں کے چلائے ہوئے طریقوں کے متعلق کچھ بولنے کی ضرورت نہیں ہے]....''نمبردار صاحب ابھی غصے میں تھے۔ میں نے یہ عالم دیکھ کر وہاں سے چلے آنے میں ہی عافیت سمجھی۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ نمبردار بہت دیر تک میرے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے تھے۔''

اچانک نوین چلتے چلتے رک گیا اور آنکھوں کا دائرہ کچھ اور کشادہ کر کے میری طرف دیکھنے لگا، اس کا تجسس لفظ لفظ کے بعد بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ سورج ہلکے ہلکے قدموں پشچم آباد کی گہرائیوں میں اپنا وجود ڈبو رہا تھا۔

○○○

''—— اور سناؤ یہ داستان بہت دل چسپ ہے!''اس نے گہرے لہجے میں کہا۔

''—— ماضی کی ریاست الور اور بھرتپور کے درمیان بسنے والے میوؤں کی تاریخ اور قصے، بہادری، شجاعت، راجاؤں کے تئیں وفاداری اور بدلے میں جاگیروں، گڑھیوں، علاقوں اور میدانوں کے عطیوں پر مبنی ہے۔ یہاں کے گھڑ چلی اور میو خاں دو بھائیوں کی شجاعت کی کہانیاں گھر گھر میں سنائی جاتی ہیں۔ انھیں یہاں کے میراسی روایتی انداز میں متعدد شہروں کے لگنے والے میلوں اور گاؤں کی بیٹھکوں میں پروگرام کر کے، گا گا کے سناتے ہیں۔ جہاں یہ پروگرام ہوتے ہیں وہاں میو، ٹکٹ لے کر شوق سے ان کو سنتے ہیں۔ اپنی قوم کے یودھاؤں [بہادروں] کے کارناموں پر سینے پھلاتے ہیں اور پرجوش انداز میں انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اس کہانی کے ہیرو دو بھائی تھے گھڑ چلی چھوٹا بھائی تھا اور میو خاں بڑا۔ ان کی شان میں کہے گئے میوات کے چھوٹے شاعر کے



یہ اشعار بچے بچے کو یاد ہیں:

باگھوڑا کی پال میں ناھر دو بھائی!
تار کٹو انگریز کو، ساری الور تھرائی!!

[باگھوڑہ [ریاست/ضلع الور کے ایک گاؤں کا نام] کے قبیلے میں دو بھائی شیر ہیں، جنھوں نے انگریزوں کے [ٹیلی فون کے] تار کاٹ دیے جس سے ساری ریاست الور کانپ گئی اور اس کا مواصلاتی نظام ٹھپ ہو گیا]

باگھوڑہ کا نام سو چڑھے سنگھ کو روپ!
انڑ گاؤں چونڈاؤ تو جا میں ہو یا ہاں سورما بھوپ!!

[باگھوڑا کے نام سے شیر پر بھی روپ آجاتا ہے اور چونڈاوتا وہ بہادر گاؤں ہے جس میں سورما پیدا ہوئے]

ان دونوں بھائیوں کو ناھر، سنگھ [شیر] اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لڑکپن کے زمانے میں اپنے گاؤں کے جنگل میں ایک شیر کو نہتے ہوتے ہوئے مار گرایا تھا۔ اس واقعے سے وہ پورے گاؤں اور علاقے میں مشہور ہو گئے۔ اس شہرت نے ان کے حوصلے بڑھائے اور وہ آس پاس کی ریاستوں کے دولت مندوں، مہاراجہ کی فوجوں، سپاہیوں اور اس علاقے میں شکار کھیلنے کے لیے آنے والے انگریزوں کو لوٹ لیتے۔ کبھی کبھی بیوپاریوں کو بھی لوٹتے مگر ان سے پورا پیسہ لے کر آدھا ان ہی کو دیدیتے، پھر ان سے کہتے، یہ آدھے روپے ہمارے اوپر قرض ہیں، تم آٹھویں دن آکر فلاں جگہ سے لے لینا۔ پھر ایسا ہی ہوتا اور وہ لوگ لٹتے ہوئے بھی خوش رہتے تھے۔''

''—— ان بھائیوں کی داستان قدیم یونانی Tragedies کی سی ہے مگر اس کا ہیرو

www.urduchannel.in

مرجاتا ہے اور ٹریجڈیس کا ہیرو زندہ رہتا ہے۔ یہ دونوں بھائی مہاراجہ الور کے خلاف گوریلا جنگ لڑتے ،راہ سے گزرنے والی فوجوں ، پلٹنوں پر حملہ کرتے اور ان سے رسد وخوراک، ہتھیار چھین کر ریاست کے غریبوں اور ناداروں میں بانٹ دیتے ،اسی کارروائی میں انھوں نے ریاست اور انگریزی حکام کے درمیان ہونے والی بات چیت کے اہم ذرائع یعنی ٹیلی فون کے تاروں کو کاٹ دیا۔اب تو حد ہی ہوگئی اور مہاراجہ آف الور کا ناطقہ تنگ ہوگیا۔ گھڑ چڑی ،میوخاں اور ان کی فوج ،انگریزوں وریاستی حکومت کی بلیک لسٹ پر چڑھ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ یہ ناجائز اور باغی فوج ،علاقے میں مزید شر پسندی مچاتی ،مہاراجہ منگل سنگھ آف الور نے اپنے درباری اور گھڑ چڑی ،میوخاں کے سگے چچا ''امراؤ'' کی مدد سے ان کی گرفتاری کی اسکیم بنائی۔اسے مقام وعہدے کا لالچ دیا۔جس کے بعد چچا نے بھتیجوں کو گرفتار کرانے کی ہامی بھرلی۔گھڑ چڑی ،میوخاں کی بربادی بھی اسی میواتی روایت یعنی وعدہ وفائی اور بادشاہ کی جانب سے یقین دہانی کی آڑ میں دی گئی دھوکہ دھڑی کے سبب ہوئی۔''

''—— وہ کیسے؟ کچھ تفصیل سے بتاؤ!''نوین نے سڑک کے کنارے کھِل رہی شوخ رنگوں کی پھلواری کا پتا توڑتے ہوئے پوچھا۔

''—— کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ نے چچا مراؤ کے ذریعے ان کی کمزوریوں ، چھپنے کے مقامات ،طریقۂ واردات ،ان کی فوج اور اس کی طاقت کے بارے میں معلومات حاصل کیں اس کے بعد ان دونوں بھائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک منافقانہ چال چلتے ہوئے اپنے جاسوسوں کے ذریعے انھیں صلح کا پیغام بھیجا۔جسے سن کر دونوں بھائیوں نے تین پہاڑوں کے درمیان واقع کھوہ میں ہونے والی پنچایت کے درمیان سرینڈر ہونے کا جواب دیا۔اسی کھوہ میں دونوں بھائیوں نے ''سالار کا جھنڈا'' گاڑا جس سے ان کی وعدہ

www.urduchannel.in



وفائی کا اظہار ہوتا تھا۔اس کھوہ کو'' کھیڑا بانسولی کی کھوہ یا بھاگ مل کی بیٹھک'' کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ اس قدر تاریخی ہے کہ اگر کسی اور مقام پر ہوتی تو تیرتھ گاہ ہوتی ،اس کی حیثیت ہیرٹیج کی سی ہوتی۔انگریز یہاں بھی آتے اور اس کی تصویریں کھینچتے یا پینٹنگس بنا کر لندن چوک، انگلستان پیلس ، برمنگھم پیلس اسکوائر، ڈنمارک لبرٹی چوک ،فورتھ کراس آف نیو یارک اور ایفل ٹاور اسٹریٹ پیرس میں نمائش لگا کر بیچتے۔مگر میواتیوں کو اپنی اس وراثت کی کوئی خبر نہیں اور نہ اس کا اس کا شعور.....

''—— تو بات ہو رہی تھی ان دو بھائیوں کی۔کہتے ہیں اسی بیٹھک میں گھڑ چڑی میوخاں کے ساتھ دھوکہ دھڑی کی گئی اور ان سے تمام ہتھیار رکھوا لیے گئے۔دھوکہ دھڑی کی بھنک لگتے ہی گھڑ چلی نے میوخاں کو فرار کردایا اور خود کو مہاراجہ منگل سنگھ کی فوجوں کے حوالے کردیا۔اس دن الور کے بڑے میدان میں ریاست کے اس ڈاکو اور مہاراجہ وانگریزوں کی ناک میں دم کردینے والے گھڑ چڑی کو دیکھنے ،ریاست بھر کے لوگ آئے تھے۔مہارانی آف الور نے بھی اسے اپنے محل خاص کے جھروکے سے یہ منظر دیکھا۔یہاں آکر میواتی میراسی اس کہانی میں ٹوئسٹ پیدا کرنے کے لیے غیر معقولی مسالا مکس کرتے ہیں۔مہارانی کے کپڑوں ،ساڑی، پلو، بالوں ،آنکھوں اور چال ڈھال کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں وہ کہا کریں اور سننے والے سنا کریں....

''—— مہارانی اپنی داسیوں سمیت جھروکے پر آئی اور اس نے ایک ہاتھ اپنے محرم پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے گھڑ چڑی پر سفید گلاب پھینکے۔مہاراجہ آف الور نے یہ عالم دیکھا تو غصہ اس کے پورے وجود پر چھا گیا۔اس نے فوراً گھڑ چڑی کو وہاں سے لے جانے کا حکم دیا۔ہرکارے چاروں طرف سے دوڑے اور گھڑ چڑی کو چاروں طرف سے پکڑ کر وہاں

سے لے گئے۔نمائش میدان،کھیل ختم ہونے کے بعد سونا ہو گیا۔

اس نمائش کے بعد مہاراجہ الور نے اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔انگریز گھڑ چلی کو لاہور ریسیڈنسی لے آئے اور یہاں کیمپ جیل میں بند کر دیا، جہاں اسے زہر دے کر مار دیا گیا۔

کہانی ابھی باقی ہے مرے دوست!'' میں نے بھی ایک نازک اندام سی ڈالی کا پتا توڑتے ہوئے کہا:

''—— اسی طرح میوات میں ایک اور بہادر کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔وہ بھی ریاست الور کے سامولا گاؤں کا باشندہ تھا اور اس کا مقابلہ بھی راست مہاراجہ آف الور اور اس کی پولیس سے تھا۔اس کا نام تو خیراتی سنگھ تھا مگر اسے سب ''خیرا خیرا'' کہہ کر پکارتے تھے۔وہ ''خیرا'' کے نام سے ہی وارداتیں انجام دیتا۔سب سے پہلے اس نے ایک ریوڑ میں سے بکری چرائی، جسے پھروتی یعنی واپسی کی رقم لے کر مالک کو واپس کر دیا گیا۔اس کے بعد چھوٹی چھوٹی چوریاں شروع کر دیں،جن سے اس کا حوصلہ بڑھتا گیا اور اب اس نے ریاست کے بڑے بڑے کاروباریوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔یہاں تک کے نوکر شاہوں کو بھی نہیں بخشا۔جس کی پاداش میں وہ چار مرتبہ گرفتار ہوا مگر ریاست کی جیلیں،کوتوالیاں وتھانے اسے ہفتے دو ہفتے سے زیادہ نہ روک سکے۔وہ ہتھکڑیوں سمیت بھاری بھاری تالے توڑ کر اور اونچی وخاردار دیواریں پھلانگ کر فرار ہو جاتا۔اپنے آخری معرکے میں تو اس نے مہاراجہ جے سنگھ آف الور کو ہی چیلنج کر دیا اور پانچ دن ورات کی کڑی محنت سے مہاراجہ کے اصطبل خاص میں سیندھ لگا کر مہاراجہ کی سب سے خوبصورت گھوڑی لے کر بھاگ گیا۔اس ناکامی نے مہاراجہ کو اس کے سامنے گھٹنے پر ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔وہ ''خیرا'' کی بہادری کا قائل ہو گیا۔

www.urduchannel.in



چنانچہ اس نے اسے عام معافی دے کر اپنے محل خاص اور اپنے خصوصی حفاظتی دستے کا سربراہ بنا دیا۔اس اعزاز کے بعد ''خیرا'' کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔اس دور میں ''خیرا'' پورے علاقے میں اسی طرح نیک نام مشہور ہوا جیسے وہ پہلے دور میں بدنام تھا۔''

○○○

''—— اب یہ قصے وہاں کے قصہ گوؤں کو ہی یاد ہیں، یا آڈیو، ویڈیو ریکارڈس میں موجود ہیں۔عام میو تو اپنی ان روایات کو بھول چکے ہیں اور اس طرح بھولے ہیں کہ انھیں اپنے بزرگوں، اپنی قوم کے ہیروز اور اپنی قوم کے لیے مرنے مٹنے والوں کی کچھ خبر نہیں، نہ انھوں نے ان کی یادگاریں بنائیں اور نہ ہی وہ اس عمل کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ اسے بے نقط مورتی اور بت کہہ دیتے ہیں۔حالاں کہ بت اور مورت دونوں الگ چیزیں ہیں۔مگر میوؤں کے نزدیک یہ خلاصے، یہ وضاحتیں اور یہ فرق کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔لہٰذا یہاں کی تیسری نسل اب اپنے بزرگوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔''

''—— یہ لوگ مسلمان کیسے ہوئے اور ان کی مذہبی تقریبات کیا کیا ہیں؟'' نوین نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دیتے ہوئے کہا:

''—— ریاست بھرتپور کا ایک بڑا اور الور کا کچھ حصہ اجمیر شریف کی منزل میں سید سالار ساہو مسعود غازی کی گزرگاہ تھا، یہ کارواں فتح پور سیکری سے اجمیر شریف جاتا اور راہ میں آنے والے افراد، خاندانوں، گروہوں، قصبات، شہروں، علاقوں، کھیڑوں، جاگیروں اور گڑھیوں کو اسلام وایمان کی روشنی میں نہلا جاتا۔راج پوت خاندان، مسلمان ہو جاتے۔ ''سالار ساہو'' کے نام کا چلہ کرتے اور ان کے نام کا علم اٹھا کر ان کے تئیں وفاداری اور اپنی بات پر اٹل رہنے کی قسمیں کھاتے۔سالار کا کارواں گزر جاتا اور میو، کسی خاص تربیت اور

توجہ کے فقدان کے باعث وہ اپنی رسوم، رواج، عقیدتوں اور توہمات کی جانب واپس لوٹ جاتے۔ تاہم اسلام و ایمان، توحید و رسالت، ان کے دلوں کے اندرون تک پیوست ہوجاتے۔ جسے وہ میراث اور وصیت میں اپنی نسلوں کو دیتے جاتے۔''

''—— جہاں تک بات ان کی مذہبی تقریبات کی ہے تو ان میں بس عید اور بقرعید ہی ہیں۔ نہ یہاں محرم منائے جاتے ہیں اور نہ عرس وغیرہ، نہ کسی سیزن اور فصل اٹھاتے وقت اور نہ ہی ساون کی آمد پر وہاں ڈھول تاشے بجتے ہیں۔ کوئل کی آواز سن کر بھی وہاں کسی کے سُر نہیں جاگتے اور بارشوں کی رِم جھم رِم جھم جھڑی سے بھی وہاں دلوں میں ترنگیں نہیں اُبھرتیں۔''

''—— یہ تو یہ، وہاں نہ جنم دن منائے جاتے ہیں اور نہ ہی وہاں نو بیاہتا جوڑوں کا ہنی مون ٹرپ وغیرہ پر جانے کا رواج ہے اور نہ اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ تو بہت دور کی بات ہے وہاں اگر میاں بیوی گاؤں میں کبھی بے تکلف انداز میں گھومنے نکل جائیں تو، سینکڑوں باتیں بن جاتی ہیں۔ انھیں پورا گاؤں بے حیا اور بے شرم مان لیتا ہے۔ گھر گھر ان کی بے حیائی کی باتیں ہوتی ہیں۔ ان کے اپنے گھر ان کی کھنچائی الگ ہوتی ہے۔ وہ گھر کے سربراہ کے دربار میں مجرموں کی طرح سر جھکائے پیش ہوتے ہیں۔ سربراہ ان سے کہتا ہے:

''—— تم نے پورے گاؤں میں ہماری ناک کٹوادی، ہماری تو ایسی تہذیب اور روایت نہیں تھی، ہمارے خان دان میں آج تک کسی نے یہ حرکت نہیں کی تم نے کچھ بھی نہیں سوچا۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ اسی عالم میں وہ دو چار باتیں اور پھنکار کر کہتا ہے جس کے بعد وہ جوڑا اس سے معافی مانگتا ہے۔ ''چلو نکلو یہاں سے'' معافی

www.urduchannel.in



میں انھیں ڈانٹ پلائی اور کھلائی جاتی ہے۔''

○○○

نوین پوچھ رہا تھا اور میں اسے بتا رہا تھا، اب تک ہم رنگ روڈ کے لائبریری گیٹ پر آ گئے تھے اور وہاں سے ہنستے، ٹھٹھول کرتے ہوئے گزرنے والے خوش پوش جوڑوں کو دیکھ رہے تھے جو ایوننگ واک کو آئے ہوئے تھے۔ شوخ ہوائیں ان کے کیوزول لباس اور شان سے بکھرے بالوں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی گزر رہی تھیں——!

''—— وہ لوگ مسلمان تو ہو گئے مگر ان کی راجپوتانہ اور ہندوانہ سوچ و فکر آج بھی اسی طرح باقی ہے، دینی، علمی، اصلاحی، اخلاقی، خاندانی، بیداریاں، ناکے برابر ہیں، حکومتوں کے فلاحی ادارے بھی یہاں کے باشندوں کی سرد مہری دیکھ کر دم توڑ جاتے ہیں۔ قومی بیداری کی تحریکوں اسکیموں کا اس علاقے میں داخلہ ممنوع ہے۔ حالاں کہ مقامی سطح پر وکاس، ترقی اور یہاں کے عوام کی فلاح و بہبود، خواتین و لڑکیوں کو روزمرہ کی تعلیم سکھانے کے لیے آنگن باڑی وغیرہ سب اسکیمیں موجود ہیں مگر ان کی فعالیت خود اپنی حالت پر ماتم کناں ہے۔ ان تنظیموں کے دفتروں پر پڑے تالوں میں زنگ لگ چکا، یا دروازے و کھڑکیاں دیمک کی نذر ہو کر ٹوٹ گئیں۔ ایک مرتبہ وہاں شہر سے آئی عورتوں نے کچھ کوششیں کی تو انھیں گاؤں کی عورتوں نے ہی لتاڑ کر لیا، اس کے بعد پھر.....''

''—— اچھا وہاں سرکاری اسکول، کالج اور اسکیمیں کس طرح کام کرتی ہیں؟'' نوین پوچھ رہا تھا۔

''—— نوین جی...!'' میں نے لمبی سانس بھری پھر بولا: ''سرکاری اسکولوں و کالجوں اور اسکیموں کی درگت، پورے ملک کی طرح میوات میں بھی بنتی ہے۔ اسکولوں و کالجوں

میں دن میں بھی اُلّو بولتے ہیں یا گائے بھینس، بکریاں بندھی رہتی ہیں۔ان کے کمروں میں اپلے، بھینسوں کا چارہ، بھوسا (سوکھا وتازہ)، بنیوں اور دکان داروں کے گودام یا علاقے کے سرکردہ اور پیسے والے آدمیوں کے ٹریکٹر، ٹرالی، زراعت کے دیگر سامان اور گاڑیوں کا گیراج بنے ہوتے ہیں۔ ماسٹر، پرنسپل، وارڈن آتے ہیں اور رجسٹر میں حاضری لگا کر کالج/ اسکول کے دفتر میں رکھ کر چلے جاتے ہیں۔ان کے مقابلے میں پرائیویٹ اسکولس بہت اچھی حالت میں ہیں چوں کہ وہ بچوں سے بھاری بھاری فیسیں لیتے ہیں، جنھیں میوا پنے کھیت بیچ کر یا قرض لے کر ادا کرتے ہیں۔''

''—— راشن ڈیلر/ایجنٹ راشن آتے ہی گاؤں اور زیریں علاقوں میں اعلان تو کراتا ہے مگر بہت کم میو ہیں جو اپنی ''خودداری'' اور ''غیرت کا چولہ'' اتار کر وہاں جاتے ہیں اور لائن میں لگ کر، مٹی کا تیل، چینی، کھاد، گیہوں اور چاول لیتے ہیں۔ چنانچہ کتنا ہی سامان یا تو برباد ہو جاتا ہے یا راشن ڈیلر اسے دکان داروں کو بلیک میں بیچ کر آمد وخرچ کے رجسٹر میں ''ڈیلیوری'' دکھا دیتا ہے.....

''—— وہاں کے سرکاری آفیسر، پٹواری، گرام سیوک، ڈاکٹر خود کو جانے کیا سمجھتے ہیں اور بدقسمت میوؤں سے اس طرح پیش آتے ہیں جیسے وہ انسان نہ ہوں۔مگر کام نکلوانے والے ان کی گھڑکیاں اور ڈانٹیں سن کر بھی کام نکلواتے ہیں۔طیش دکھانے سے ان کا ہی کام نہ ہونے یا فائل کو کہاں سے کہاں غائب ہو جانے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔تحصیلوں اور ضلع آفسوں میں معمولی معمولی کام بھی مہینوں میں ہوتے ہیں، دوسری صورت میں بابو یا دلال کی مٹھی گرم کرو یا منہ بھرائی، یا ''خرچہ پانی دو''—— ورنہ جوتیاں توڑتے پھرو۔ بوڑھی بوڑھی عورتیں، بوڑھے بوڑھے مرد اپنی پنشن کے لیے گھنٹوں ڈی ایم، ایس ڈی ایم، علاقائی

www.urduchannel.in



دفتر یا بنکوں کے باہر دھوپ، سردی، بارش میں صبح سے ہی پتھرائی آنکھوں سے کسی چمتکار کے منتظر بیٹھے رہتے ہیں، مگر اچانک بابو جی کا چپراسی آ کر کہتا ہے کہ آج بابو جی، جے پور، چندی گڑھ یا لکھنؤ چلے گئے۔یا کوئی بنک والا آ کر کہتا ہے کہ تمھارے کھاتے میں پیسہ نہیں آیا۔ اسی طرح جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ بابو جی کی واپسی کب تک ہوگی؟ اس سوال کا جواب وہ آنکھیں نکال کر بدتمیزی سے دیتے ہیں۔''—— ہمیں کیا پتا، ہم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے، چلو نکلو یہاں سے، بکواس مت کرو——''

''—— اور یہ سن کر ان پر بدنصیبوں پر بجلی ٹوٹ پڑتی ہے۔صبح سے چائے یا لسی پی کر آئے ہوئے یہ لوگ وہیں ڈھیر ہو جاتے ہیں، بہت کم ہوتے ہیں جو اپنی لاٹھیاں [Walk Stick] گھسیٹتے ہوئے بس اڈہ پہنچتے ہیں اور ناکام اپنے گاؤں لوٹ جاتے ہیں۔''

اس موقع پر نوین کے چہرے پر بھی بجلیاں کڑکنے لگیں، آنکھوں میں عجیب سی چیز لہریے لینے لگی، جسے اس نے نہایت کامیابی سے چھپانا چاہا مگر درد آشنا کی آنکھوں نے دیکھ ہی لیا۔

''—— نوین اسی پر بس نہیں! وہاں کے معمولی سرکاری آفیسر بھی بداخلاقی کی انتہا کر دیتے ہیں۔'' میں نے آنسوں خشک کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''—— وہ اپنی پوسٹ اور جاب کے رعب میں نہ عورتوں کی دہائی سنتے ہیں اور نہ مردوں کی بپتا، اسی دوران اگر کوئی پڑھا لکھا شخص ان کی بداخلاقی [Rudely Behaviour] پر معترض ہوتا ہے تو بابو جی اسے ایسی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جیسے ان کے شعلوں سے بھسم ہی کر دیں گے۔وہ آپ آپ کہتا ہے، بابو جی تو تو کہتے ہیں، وہ سر...سر...کہتا ہے اور بابو جی سب کے سامنے من من بھر کی گالیاں دیتے ہیں جس سے اس معصوم کی ریپوٹیشن اور عزت خاک میں مل جاتی ہے۔پھر وہی لوگ اسے پاگل قرار دیتے ہوئے اسے ڈانٹتے ہیں جن

کے لیے وہ لڑتا ہے، اسے جذباتی اور ناسمجھ کہہ کر اس کے حوصلے پست کرتے ہیں۔ پھر وہ کوئی گہری بات سوچ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ جو لوگ خود نہیں بدلنا چاہتے، انھیں کوئی کیا بدل سکتا ہے، جو لوگ خود مرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے مسیح ابن مریم بھی کیا کر سکتا ہے۔

''—— میوات کا خاندانی سماج کیسا ہے؟'' نوین نے گہرا سوال پوچھا۔

''—— میوات کا میو سماج پنچایتوں اور گاؤں کے چودھریوں کے بل پر چلتا ہے۔ کہیں کہیں تو ان کا اثر و رسوخ ایسا ہے کہ سرکاریں، پولیس اور انتظامیہ بھی انھیں تسلیم کرتی ہیں اور ان کے فرمانوں و فیصلوں کے سامنے سر جھکاتی ہیں۔ یہاں کے لوگ، بالخصوص میو، سرکاروں اور سیٹھوں کی نوکری کو معیوب سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ہماری روایات اور خودداری کے خلاف ہے۔ ہمارے باپ دادا نے کبھی کسی کی نوکری نہیں کی۔ وہ بھوکے رہے مگر اپنے اصولوں سے سمجھوتا نہیں کیا۔ ہم بھی ان کی ڈگر پر چلتے ہوئے قوت بازو پر یقین رکھتے ہیں، ہم کھیتوں میں کام کریں گے، اینٹ پتھر اٹھائیں گے، چھوٹا موٹا کاروبار کریں گے، مگر نوکری نہیں کریں گے۔''

''—— پھر کیا کریں گے، یا کیا کرتے ہیں؟ وہ...؟'' نوین نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''—— کیا کریں گے یا کیا کرتے ہیں؟ سچ کہوں تو کچھ بھی نہیں کرتے۔ تھڑوں، یا خالی دکانوں، مکانوں میں بیٹھ کر سارا سارا دن تاش، سیپ، جوا کھیلتے ہیں یا سٹہ لگاتے ہیں۔ سارا سارا دن وہ یونہی گنوا دیتے ہیں۔ خاص طور سے PSL [پاکستان سپر لیگ] اور IPL [انڈین پریمیئر لیگ] ٹورنامنٹس کے انعقاد کے زمانے میں تو وہ خوب کماتے ہیں اور خوب گنواتے ہیں۔ تمھیں سن کر حیرت ہوگی کہ کئی نوجوان تو ان میلوں میں کئی لاکھ تک جیت لیتے ہیں اور کئی اپنے گھر کے زیور تک سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں اگر تمھیں سناؤں تو کتنے

www.urduchannel.in



ہی ایسے واقعے ہیں، کتنے ہی ایسے کردار ہیں، کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو اس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔''

''—— موجودہ زمانے میں تو ان کی یہ ہیکڑی نکل ہی گئی۔ میوؤں کی زمینوں، علاقوں اور خطوں پر بڑھتے سرکاری اثر و رسوخ اور بیکاری و بے روزگاری، مہنگائی و معیشت کی بربادی نے انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ صدیوں تک ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔ ہمارا کا ماضی بہت ہی تاریک اور غیر ضروری انا کی بھینٹ چڑھ گیا۔ انھیں مہاراجاؤں اور سرداروں نے بس استعمال ہی کیا جس کے سبب ان کی کوئی انفرادی حیثیت قائم نہ ہو سکی۔ آج میو قوم ہندوستان کی ایک قدیم ترین قوم ہونے کے باوجود اپنی شناخت اور پہچان نہ بنا سکی۔ آج بھی میوات اور میوؤں کا نام سن کر ملک کی دیگر قوموں کے ذہنوں میں وہ تاریخ اور وہ واقعات آجاتے ہیں جو میواتیوں کی شجاعتوں، ایمانداریوں، ملک و قوم کے تئیں وفاداریوں کے بجائے منفی تصویروں کے البم پر مشتمل ہیں۔ یعنی وہ چور تھے۔ ڈاکو تھے۔ دلّی اور اس کے آس پاس کے علاقے ان کے قہر سے کانپتے تھے، انھوں نے الور اور بھرتپور کی ریاستوں کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ پھر ان کے منہ اس طرح بن جاتے ہیں جیسے انھوں نے کوئی قابل نفرت چیز دیکھ لی ہو۔ اس کے لیے میوات ہی ذمے دار ہے اور میوؤں کی پگڑیوں اور پھینٹوں کے طُرّوں پر ہی اس کی ذمے داری عاید ہوتی ہے۔ میوؤں کو اپنی اس کمی اور ناعاقبت اندیشی کی ایک سخت ترین سزا اس وقت ملی تھی جب ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا اور راج پوتانہ کی اکثر ریاستیں انڈین یونین میں شامل ہو گئیں۔ اس وقت الور اور بھرتپور کے مہاراجاؤں نے مشترکہ طور پر علاقہ میوات میں اپنی افواج کو درندگی مچانے کے لیے بھیج دیا تھا، انھوں نے اس کارروائی میں مقامی ہندوؤں، نچلی ذاتوں اور میوؤں کی

احسان مند قوموں کو ساتھ لے کر انھیں کھدیڑ ہی دیا۔ اس وقت میوؤں کی لاٹھیاں، شجاعت، گھوڑے، بلّم، بندوق، پنچائتیں، چودھراہٹیں کچھ کام نہ آئیں اور انھیں اراولی کی پہاڑیوں میں عین اس وقت، جب کہ وہ انگریز ی علاقے میں داخل ہونے والے تھے، بمباری اور دھاڑ [ہجومی تشدد] کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، بہت تھوڑے تھے جو اس قیامت سے بچ کر پہلے گوڑگانوہ پھر دلّی جامع مسجد کے ''اردو پارک'' میدان پہنچے اور وہاں سے سیدھے سرحد پار پاکستان اترے۔''

''—— ایسا ہونا ہی تھا، میوات اور میوؤں نے ہندوستان کے لیے کیا کیا تھا، جو انھیں یہاں رہنے دیا جاتا؟ یہ ایسی باتیں تھیں جن کے باعث یہاں کے راجاؤں اور ہندو اکثریتی طبقات، حکومتی اہلکاروں اور اس وقت کے مرکزی وزیر داخلہ، سردار پٹیل بھی نے ان کے ہندوستان میں رہنے پر انگلیاں اٹھادیں تھیں، وہ سب کہتے پھرتے تھے: ''**تم نے پاکستان تو لے لیا، تمھارے لیے پاکستان تو بن گیا، اب تمھارا یہاں کیا کام—— میو بھاگو پاکستان، میو بھاگو پاکستان۔——**''

''—— یہ دل خراش نعرے آج تو نہیں لگتے مگر میوات کی ہندو قوموں کے دلوں میں کہیں نہ کہیں یہ بیٹھے ہوئے ضرور ہیں، چنانچہ جب بھی کبھی ہندو مسلمانوں کے درمیان معمولی بات پر کہاسنی ہوتی ہے، اسے فوراً فرقہ وارانہ رنگ دے دیا جاتا ہے اور پولیس وانتظامیہ اسی ذہنیت کے ساتھ صرف میوؤں کو ہی گرفتار کرتی ہیں اور انھیں کسی ملک دشمن عناصر کی طرح ٹریٹمنٹ کرتے ہوئے جرمانے اور سزائیں دیتی ہیں۔ ان کی ضمانتیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ضبط ہوجاتی ہیں۔ علاقے کے مسلم اکثریتی گاؤں، قصبوں اور علاقوں کو ''پاکستان'' کی طرح دیکھا جاتا ہے اور ان پر ہندوؤں کی جانب سے چڑھائی کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جب یہاں کے ہندو مسلمان آپس میں مل جل کر رہتے تھے اور ان کے دکھ درد

www.urduchannel.in



سانجھے تھے۔ مگر اب یہاں کبھی گئو رکشا کے نام پر تو کبھی مذہبی آستھا کے نام پر مسلمانوں کو سرعام مار دیا جاتا ہے۔''

''—— ایک بار ایسا ہوا کہ ہمارے گاؤں کے مندر میں ہندوؤں کے نچلے طبقے کے افراد نے شرارت کرتے ہوئے مورتی توڑ دی اور مندر کے ایک حصے میں آگ لگادی، صبح ہوتے ہوتے یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ خبر پھیلتے ہی شک کی سوئی اپنے آپ مسلمانوں کی طرف گھوم گئی۔ بس پھر کیا تھا، علاقائی پولیس سمیت ریاستی پولیس کی پیرا ملٹری اور سینٹرل ریزرو پولیس کی ٹکڑیاں، وہاں اس طرح آئیں جیسے اس جگہ پر غیر ملک کی افواج نے قبضہ کرلیا ہو، انھوں نے اندھا دھند مسلمانوں کی ضمانتیں چھیننا اور انھیں نے بلا جرم قید کرنا شروع کردیا۔ پھر اس سے پہلے کہ یہ صورت حال مزید دھماکہ خیز ہو، اس کارروائی کو انجام دینے والے ہندوؤں نے مفاد عامہ کی خاطر خود ہی اعتراف جرم کرلیا۔ جس کے بعد پولیس نے مسلمانوں پر سے زور کم کرکے ان اقبالی مجرمین کو محض دکھانے اور اس ہنگامے کو فرو کرنے کے لیے جیل میں بند کردیا اور پھر ان کے اقبال جرم کے صلے میں انھیں کلین چٹ دے کر بغیر کسی ضمانت یا جرمانے کے رہا کردیا۔''

''—— حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہاں ہندو۔ مسلمانوں کے آپسی لین دین، آس پاس گھروں، کھیتوں، کھلیانوں، دکانوں اور مارکیٹوں کے واقع ہونے اور قریب قریب ایک جیسے رہن سہن و پہناوے کے باوجود ان کے دلوں میں میل ملاپ نہیں ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اب تک وہ مسلمانوں کو دل سے قبول ہی نہیں کرسکے ہیں۔ حالاں کہ وہ ان کے ہی بھائی ہیں، مگر ''اسلام'' اور ''ہندوازم'' کے باعث ان میں ایسے فرق آگئے جنھوں نے ان میں صدیوں کے فاصلے پیدا کردیے۔ بغیر کسی سیاسی مقصد کے وہ ایک دوسرے کی شادی، یا

تقریب میں آتے ہیں اور نہ اسے پسند کرتے ہیں۔ مسلمان بھی اس معاملے میں ان سے پیچھے نہیں ہیں، وہ بھی اس نفرت کا جواب نفرت سے ہی دیتے ہیں چنانچہ ان کے گھروں میں نہ تو خود جاتے ہیں اور نہ چھوٹے بچوں کو جانے دیتے ہیں، اسی طرح اگر ہندو کوئی تیج، تیا، چالیسا، یا عام بھوج و دعوت کرتے ہیں تو میو، اپنے بچوں کو سختی سے منع کرتے ہیں، اگر کوئی بچہ ان کی نظر بچا کر وہاں چلا بھی جائے تو پتا چلنے پر اس کو عبرتناک سزا دی جاتی ہے، جس کا وہ تصور کر کے بعد میں بھی کانپ جاتا ہے۔ شدت دونوں طرف موجود ہے، یا ایک طرف زیادہ اور دوسری طرف کم، یا اس کا الٹا۔ چنانچہ میوات کے ہندو اور میو اسی طرح تفریق اور آپسی پھوٹ کی زندگی جی رہے ہیں۔''

اب ہم لوگ چلتے چلتے یونیورسٹی کے اراولی نیشنل گیسٹ ہاؤس لان کی بنچوں پر بیٹھ گئے تھے جو اسٹیڈیم روڈ کے پرفضا مقام پر واقع ہے۔ ہماری باتیں اسی طرح جاری تھیں۔ جب میں کچھ دیر کے لیے رُکا تو نوین پھر بول پڑا:

''—— وہاں کی پالیٹکس کیسی ہے اور نیتا اپنے ووٹروں سے کس طرح پیش آتے ہیں؟''

نوین کے اس سوال نے مجھے تلخ حقیقتوں کے بیان پر مجبور کر دیا۔

''—— وہاں کی چھوٹی بڑی سیاست کا حال بھی وہی ہے جو پورے ملک کا ہے، یہاں کے نیتا بھی اپنے ووٹروں سے علاقے کی ترقی اور خوشحالی کے وعدے کر کے، دوسری سرکاروں کو برا بھلا، ناکارہ اور نکما کہہ کر ووٹ حاصل کرتے ہیں اور پھر ایک بار جیتنے کے بعد پانچ سال بعد ہی شکل دکھاتے ہیں۔ حسب دستور غریب علاقوں اور محلوں کے گھروں کی کنڈیاں، پھاٹک، دروازے کھڑکھڑاتے ہیں اور ووٹ مانگتے ہیں۔ غریب عوام ان سے کچھ کہے سنے بغیر پھر انھیں جتا دیتے ہیں اور اس کے بعد اسی غریب اور بھولے بھالے

www.urduchannel.in



ووٹر کے لیے ان کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔''

''—— نوین! یہ بہت کڑوا اور تکلیف دہ سچ ہے کہ مرکزی و ریاستی حکومتوں، سرکاروں، انتظامیہ اور سیاسی پارٹیوں کی مسلسل سرد مہری نے میوات کو حد سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ یہاں نہ سرکاری فیکٹریاں ہیں اور نہ ملیں۔ نہ پلانٹس ہیں اور نہ اسٹور تیج۔ کم سے کم ان محکموں میں ہی یہاں کے لوگوں کو روزگار مل جاتا یا اس بہانے سے علاقے کی ترقی ہو سکتی۔ حالاں کہ سرکاروں میں میوات کی نمایندگی بھی اچھی خاصی تعداد میں ہوتی ہے۔ میو، ریاستی سرکاروں (ہریانہ و راجستھان) میں منسٹر بھی بنتے ہیں اور انھیں پارٹی کی سطح پر یہاں کے چارج بھی دیے جاتے ہیں۔ مگر نہ ایم پی صاحب کو اپنا علاقہ دیکھنے کی فرصت ہوتی ہے اور نہ ہی منتری، ایم ایل اے/ودھایک صاحبان جیتنے کے بعد یہاں آنا پسند کرتے ہیں اور نہ عام نیتا ہی۔ انھیں لگتا ہے کہ یہاں آنے سے اُن کے مہنگے، اجلے اور سفید ڈریس/سوٹ، گندے ہو جائیں گے، ان میں دھبے پڑ جائیں گے۔ ان کے چمکتے جوتوں پر ریت چڑھ جائے گی اور ان کی چمک پھیکی پڑ جائے گی۔ وہ اپنے ہی ووٹر اور قوم کے افراد کو ہی گری نظر سے دیکھتے ہیں اور انھیں گندہ و نیچ سمجھتے ہیں۔ انھیں جاہل، گنوار، ننگا، بھوکا، غریب کہہ کر ان کی توہین کرتے ہیں۔ وہ یہاں کی دھوپ، سردی میں آنے کے بجائے، جے پور یا چندی گڑھ میں ملے اپنے کوارٹرز میں زیادہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ جن کا دماغ جیتنے کے بعد اس قدر آسمانوں کو پہنچ جائے، وہ میوات کے بارے میں کیسے سوچ سکیں گے؟ وہ میوات کے لیے کیا پیکج لائیں گے اور وہاں کیا ترقیاتی کام کرائیں گے؟ وہ اسمبلیوں میں میوات کے لیے کیا بحث کریں گے؟ وہ میوات کے مسائل کو کس طرا ٹھائیں گے؟ ان کا حال تو یہ ہے کہ کوئی اگر ان سے ملنے جائے تو وہ خالی رہتے ہوئے بھی مونچھوں والے چپراسی سے

کہہ دیتے ہیں کہ ’’بول دو! صاحب میٹنگ میں ہیں، ابھی نہیں مل سکتے۔‘‘ اور اگر ملنے والا ضد کرے، روئے، گڑگڑائے تو اس سے دوچار سخت و توہین آمیز باتیں کہہ کر ملا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی پیسے والی یا سفارشی پارٹی ملنے آئے تو، اس کے استقبال کے لیے نیتا جی خود اپنے ڈرائنگ روم سے نکل کر آتے ہیں۔ ان کی بات تو رہنے دیں۔ وہاں کا ایک سرپنچ جیتنے کے بعد گاؤں اور علاقے کی ترقی کرنے کے بجائے اپنے گھر، مکان اور فارمس بنانے لگتے ہیں۔ اپنے پورے کنبے کے قرض اتارتے ہیں، اپنے بچوں کی شادی کراتے ہیں، ٹریکٹر یا گاڑیاں خریدتے ہیں۔ حالاں کہ وہ پیسہ انھیں گرام پنچایت کی سڑکوں، راستوں، نالیوں، تالابوں کو بنانے اور گاؤں کو خوش حال کرنے کے لیے دیا جاتا ہے مگر اسے وہ خود ہی ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہ صورت حال علاقے کی مزید خراب حالت کی ذمے دار ہے۔‘‘

’’—— تمھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہاں آج تک نیشنل ریلوے لائن نہیں بنی یا نہیں بننے دی گئی۔ چنانچہ اگر کوئی میو کبھی ریل میں بیٹھ جائے تو خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہے اور اس سفر کی کہانی لوگوں کو اس طرح سناتا ہے جیسے اسے دنیا کی بہت بڑی چیز مل گئی ہو۔ آج کے ترقی یافتہ ہندوستان میں جہاں ایک طرف میٹرو اور بلٹ ٹرینیں چل رہی ہیں، اس ملک میں دوسری طرف یہ صورت حال۔ کتنی عجیب بات ہے نا۔ حالاں کہ یہاں ماہتما گاندھی بھی آ چکے ہیں۔ اتنی تاریخی جگہ ہونے کے باوجود میوات سے حکومتوں کا یہ برا سلوک ہے۔ پتا نہیں اس کا ذمے دار کون ہے؟ اس اعزاز کے باوجود بھی آج میوات اپنی خستہ حالی اور بے بسی پر رو رہی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ دلّی اور میوات کو کنیکٹ کرنے کے لیے دلّی۔ الور ہائی وے بنا دیا گیا اور اسے NH-8 کا نام دیا گیا ہے جس پر نیشنل ہائی وے اتھارٹی آف

www.urduchannel.in



انڈیا [NHAI] انڈر پاس یا کوریڈور بنا کر عجیب عجیب سے تجربے کرتی رہتی ہے جس سے آمد و رفت حد سے زیادہ متاثر ہوتی رہتی ہے اور عام زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی نام نہاد NH-8 پر ہریانہ اور راجستھان ٹرانسپورٹ کی خستہ حال اور ٹوٹی بسیں چلتی ہیں جو پورے راستے ڈھول تاشے سے بجاتی جاتی ہیں اور اگر بارش کا موسم ہو تو مفت میں نہلاتی ہوئی جاتی ہیں۔ کھڑکیوں کے شیشے نکلے ہوئے اور فرش جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے۔ جن سے سڑک کی ریت اڑ اڑ کر بس میں آتی ہے اور تھوڑی ہی دیر میں نئے و دھلے کپڑے مٹی میں مل کر رہ جاتے ہیں اور چہروں پر دھول چڑھ جاتی ہے۔ ان کی سروس بھی انتہائی بورنگ والی ہوتی ہے۔ کسی نے ایک کلومیٹر سے ہاتھ دے دیا تو وہ باوجود ایکس پریس ہونے کے، وہیں کھڑی ہو جاتی ہے، پھر ہاتھ دینے والے کو بٹھا کر ہی چلتی ہے۔ گورنمنٹ بسوں میں یہاں چھتوں پر سواریوں کو بٹھا دیا جاتا ہے۔ دراصل کنڈکٹر و ڈرائیوروں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہائٹ کمائی کے ساتھ کچھ بلیک بھی ہو جائے۔ انھیں سواریوں کی جانوں اور وقت کی بربادی سے زیادہ فکر اپنی جیب کی ہوتی ہے۔ وہ بھرنی چاہیے، چاہے جیسے بھی ہو۔‘‘

’’—— وہاں کے گاؤں میں راستے کچے، دھول بھرے، سڑکیں ٹوٹی ہوئیں، سیور، ڈرینج اور ایگزہاسٹ ہول، وہاں ہوتے ہی نہیں، لہٰذا بارش اور گھروں کا پانی سڑکوں اور راستوں میں بھرتا رہتا ہے۔ جو مہینوں مہینوں نہیں سوکھتا اور پورے علاقے میں گندگی مچا دیتا ہے۔ لائٹ کا انتظام پورے سال بدانتظامی کے نمونے پیش کرتا ہے، موسم گرمی میں تو زندگی جہنم زار بن جاتی ہے، نہ دن میں بجلی اور نہ رات میں اجالا۔ بس اندھیرا اس پورے علاقے میں حکومت کرتا ہے۔ یہی حالات مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ دلّی کے آس پاس کے کتنے ہی علاقے ترقی کرتے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچ گئے، مگر میوات کے نصیب

کا تارہ ابھی تک بجھا ہوا ہے۔اس کی چمک جانے کون لے گیا اور جانے وہ کب چمکے گا۔''

''—— میوات کی خاص تجارت کیا ہے؟'' نوین نے بنچ پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر کہا۔

''—— میوؤں یا دوسری قوموں کی کوئی خاص صنعت ہے نہ تجارت ہے نہ روزگار بس شہروں میں کچھ دیسی کمپنیاں ہیں یا پرائیوٹ دودھ وغیرہ کے پلانٹس۔اسی طرح چند نیشنل بینکوں کی شاخیں ہیں۔جن میں غریب، محنت کش، کسان اپنی خون پسینے کی کمائی جمع کرتے ہیں۔یہی بینک زمینوں کی ضمانت پر اسی پیسے کو قرض اور چھوٹے موٹے کاروبار کے لیے لون کی صورت میں دیتے ہیں اور میعاد پوری ہونے پر پولیس کی مدد سے کھیتوں، زمینوں، گھر کے قیمتی سامانوں سب پر قبضہ کر لیتے ہیں۔نہ وہ مہلت دیتے ہیں اور نہ ہی کسی پنچایت یا نیتا سے ڈرتے ہیں۔انھیں ٹریکٹر، زمین، سونا چاندی، زیور، دکان یا گھر پر قبضہ کرنا ہے تو کر کے ہی رہیں گے۔جس گھر میں بینک والوں کی ریڈ پڑتی ہے اس گھر کی حالت ایسی ہو جاتی جیسے اسے سماج سے ہی نکال باہر کر دیا گیا ہو۔اس مصیبت کی گھڑی میں کوئی بھی ان بد نصیب لوگوں کی مدد نہیں کرتا، سب تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔بینکوں کے ذریعے قرقی کے شکار کتنے ہی کردار ایسے ہیں جو سماج اور علاقے میں منہ چھپائے پھرتے ہیں...''

''—— ہمارے پڑوس کے گاؤں کے چودھری رمضان نے مقامی پنجاب نیشنل بنک، بنک آف بروڈہ اور دو تین چھوٹی چھوٹی فائنانشیل کمپنیوں سے آٹھ دس کروڑ کا لون لیا تھا۔بنکوں اور کمپنیوں نے اس کی زمینوں کی ضمانت، علاقے کے سرپنچ اور کچھ بڑے لوگوں کے نام پر چھے سال کی واپسی کی مدت پر اتنی بڑی رقم دے دی۔مگر اس کی تو نیت ہی کچھ اور تھی۔اسی رقم سے اس نے دھوم دھام اور بے جا اصراف کے ذریعے اپنے دو تین بچوں کی شادی کرانے کے ساتھ ساتھ ایک غریب آدمی رحیم خاں کی زمین پر زبردستی قبضہ کر کے،

www.urduchannel.in



عالی شان گھر بھی بنا لیا۔رحیم خاں اور اس کی بیوی گاؤں اور سرکاری دفتروں میں اپنی زمین چھڑانے کے لیے دہائیاں دیتے پھرتے تھے، مگر لوگ چودھری رمضان کے پیسوں کے گھمنڈ اور قہر سے ڈرتے تھے۔ایک دن رحیم خاں اور اس کی بیوی، تیزی سے دوڑتی ہوئی بس کی چپیٹ میں آ گئے۔وہ بس انھیں کچلتی ہوئی چلی گئی۔دونوں غریبوں کے جسموں کے چیتھڑے سڑک دور تک پھیل گئے...

''—— چودھری رمضان کا تین منزلہ مکان بن گیا۔اس کے باوجود بھی اچھی خاصی رقم بچی رہی۔جس کا استعمال اس نے اپنے پوتے کے عقیقے میں استعمال کیا۔اس عقیقے میں دیگر پکوانوں کے ساتھ ساتھ سولہ من دودھ کی مٹھائیاں بنوائی گئیں۔چودھری نے اپنی اس دعوت میں علاقے کے بڑے بڑے لوگوں، چودھریوں اور نیتاؤں کو بلایا۔ان کا سواگت روایتی انداز میں کیا۔ان کے لیے شراب اور دیگر ایسی چیزیں پیش کیں۔اس دعوت کے بعد پورے علاقے میں چودھری رمضان کی مہمان نوازی، اس کے عالی شان گھر اور امیری کے چرچے ہونے لگے۔جب چودھری صاحب کو اس شہرت اور مقبولیت کے بارے میں بتایا جاتا تو اس کی مونچھوں میں دو تین بل اور پڑ جاتے اور اس کا سینہ فخر سے پھول جاتا۔''

''—— اس دعوت کے بعد چودھری صاحب کے بچے اور دیگر رشتے دار بھی علاقے میں اپنی دھاک بٹھانے لگے۔جس کو من چاہا، پیٹ دیتے اور جس کو چاہتے پریشان کرتے۔راستوں میں چلتی نوعمر لڑکیوں اور عورتوں کو چھیڑتے اور پورے علاقے میں دندناتے پھرتے۔مہنگے مہنگے کپڑے پہنتے، امپورٹڈ بائکس کو ون وہیل پر ہوا میں اڑاتے ہوئے کہیں بھی نکل جاتے۔ایک دن تو دردناک حادثہ ہو گیا۔چودھری صاحب کے منجھلے اور کنوارے بیٹے کا اسی بائک ون وہیل رائڈنگ میں خطرناک اکسیڈینٹ ہو گیا۔یہ خبر چودھری صاحب، چودھرائن اور ان کے خاندان کے خیر خواہوں پر بجلی بن کر گری۔مگر اس

سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، انھیں دوسری خبر ملی کہ وہ لڑکا اسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں دم توڑ گیا۔ چودھرائن کو اگر دو تین عورتیں نہ پکڑے ہوتیں تو وہ نیچے ہی آ رہی ہوتی۔ یہی حالت چودھری صاحب کی تھی۔ اسے رہ رہ کر غش آ رہے تھے اور لوگ اسے سنبھال سنبھال کر صوفوں پر بٹھا رہے تھے۔ بچے کی لاش، پوسٹ مارٹم کے بعد عالی شان گھر میں کفن میں لپٹی رکھی تھی، اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت ناچ رہی تھی جس کی بے اختیار بلائیں لینے کو من کرتا تھا۔ یہ صورت حال وہاں موجود ہر فرد کی آنکھ سے آنسو گرا رہی تھی۔ وہاں موجود سب ہی غم سے نڈھال تھے۔ اسی عرصے میں رات ہوگئی۔ اس معصوم کو اسی کالی رات کی تاریکی میں دفنا دیا گیا۔ اسی کے ساتھ چودھری صاحب کا گویا ایک بازو ٹوٹ گیا اور چودھرائین کے کلیجے کا ایک نازک سا حصہ بھی۔ چودھری چودھرائن اس حادثے کے بعد بری طرح ٹوٹ گئے تھے۔ کل تک فخر سے ہنسنے والا اور مونچھوں میں بل دینے والا چودھری رمضان اب پہچانا بھی نہ جاتا تھا۔ دو چار دن میں ہی قیامت کا بوڑھاپا اس کے پورے وجود پر چھا گیا تھا۔ اس واقعے کو حالاں کہ کئی مہینے ہو چکے تھے۔ مگر اسے تو یہ آج کی ہی بات لگتی تھی۔ آخر ایک دن صبر آیا۔ صبر آیا اور سارے غموں کو اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ غم تو چلے گئے مگر چودھرائن کو ایک روگ دے گئے۔ ایک دن وہ خون تھوک رہی تھی۔ اس اطلاع پر اسے اسپتال میں داخل کیا گیا تو پتا چلا کہ ٹی بی ہوگئی، وہ بھی آخری اسٹیج میں ہے۔ اس خبر نے چودھری رمضان کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے، اب وہ بھی دل پکڑ کر بیٹھ گیا...

''—— غریبوں کے خون پسینے کی کمائی پر اس طرح کی نیت خراب کرنے کا انجام اس کے علاوہ اور کیا ہوتا؟ ادھر چودھرائن اسپتال میں آخری سانسیں لے رہی تھی اور دوسری جانب بنک والے مقامی پولیس کے ساتھ چودھری صاحب کے گھر کو سیل اور قرقی کر رہے تھے۔''

○○○

www.urduchannel.in



''—— میوات کا سماج کیا ہے، یعنی سماجی تصور کس طرح کا ہے؟'' میں حیران تھا کہ نوین کیا پوچھ رہا تھا، تاہم سوال کو شرمندۂ جواب کرنا ہی تھا۔

''—— میوات کا سماج!؟'' میری کرب ناک ہنسی نکل گئی۔ چند ثانیے بعد میں نے بڑی مشکل سے اس دردانگیز ہنسی کو روکا۔

''—— نوین جی! اس کا حلیہ بیان کرنے سے پہلے کچھ اہم اور یہ تلخ سوالات ہیں جنھیں میں خود سے کرتا ہوں۔ میوات کا کوئی سماج بھی ہے؟ کیا وہاں کوئی سوسائٹی بھی ہے؟ کیا میواتی کوئی تمدن بھی جانتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب نا میں ملتا ہے۔ یعنی میواتیوں کی کوئی سوسائٹی، کالونی، کوئی تمدن، کوئی رواج، کوئی روایت یا ثقافت نہیں ہے۔ اب وہاں جو بھی ہے وہ برادری اور گوتیں/ گوتریں ہیں۔ وہاں کے میو اور بڑے چودھری اسی برادری اور گوتوں کی بنیاد پر رشتے ناتے کرتے ہیں اور اپنی شناخت و روایات کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی برادری اور گوتیں علاقائی فلاح و بہبود، ترقی اور خوشحالی کے کام کرنے کے بجائے دوسری برادریوں اور گوتوں پر برتری حاصل کرنے کے لیے کام کرتی ہیں۔ وہ فخر سے اپنے خاندان کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے کو نیچا دکھاتے ہیں۔ اکثر تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہریانہ، راجستھان اور یوپی کے میوات کے علاقے کے افراد ایک دوسرے کو اپنا غیر سمجھنے لگتے ہیں اور خود کو عقل مند مانتے ہوئے دوسروں کو احمق سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے ایک لفظ ''بوچ'' اختیار کر رکھا ہے جس کا استعمال وہ اپنی باتوں میں اکثر حقارت سے کرتے ہیں:

''ارے وا کی [اس کی] بات چھوڑو، اُوْ [وہ] تو راجستھانی بوچ ہے——''

''ارے وا کی [اس کی] بات چھوڑو، اُوْ [وہ] تو ہریانہ کو [کا] بوچ ہے——''

''او پی (یوپی) والان پے (والوں کو) کہا (کیا) آوے [آتا] ہے——''

''اُن کی بھی بھلی[اچھی] چلائی، وے[وہ] کہا[کیا] جانیں——''

''—— پھر ان کی بے وقوفی اور بھول چوک کے نہ جانے کب کے قصے اس طرح سنائے جاتے ہیں جیسے سنانے اور سننے والوں پر ہی دنیا کے عقل مندی ختم ہوا اور وہی دنیا کے آخری عقل مند ترین انسان ہوں۔ ریاستوں کی بات تو جانے دیجیے، ہمسایہ گاؤں، گڑھیوں اور تحصیلوں تک کی بھی یہی حالت ہے، ممکن ہے یہ کیفیت ملک کی دوسری ریاستوں اور خطوں کی بھی ہو، مگر میوات میں اس کا چلن کچھ عجیب ہی لگتا ہے، جہاں دور دور تک زبان ایک، رشتے داریاں ہر طرف پھیلی ہوئیں، رہن سہن کا طریقہ یکساں، کھانے پینے کے انداز ایک جیسے اور طبعیات و خیالات میں بہت زیادہ یگانگت ہے۔ وہاں اس طرح کی باتیں چہ معنی دارد؟ مگر اس کے باوجود بھی یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے اور ایک ایسا ناسور جس نے میوات کے جسم کو خوں فشاری پر مجبور کر دیا ہے۔''

اب رات کچھ گہری ہو رہی تھی لہٰذا ہم گیسٹ ہاؤس کی بنچ سے اٹھ کر ہاسٹل کی طرف چل دیے—— راہ میں نوین نے ایک اور ایک بات پوچھی۔ جس کے جواب میں، میں نے اسے بتایا۔

''—— میوؤں کے ایمانی و اعتقادی اصلاح کے لیے مدرسوں کا نظام یہاں ملک کی آزادی کے چند سال بعد سے ہی جاری ہے بلکہ کچھ مدارس تو انگریزی عہد میں ہی وجود میں آ گئے تھے اسی طرح میوات کے سب سے بڑے اور قابل فخر برانڈ، تبلیغی تحریک کا آغاز بھی **12** اگست **1934** کو ہوا۔ جس سے میوات کی دنیا بھر میں ایک شناخت قائم ہوئی۔ میوات تبلیغ کا مرکز بن گیا یہاں سے جماعتیں تبلیغی اصولوں، رسوم، قواعد اور ضابطوں کے تحت بیرون اور ملک کے مختلف گوشوں میں جاتیں ہیں۔ یہاں ہر سال مہنگے خرچوں اور انتظامات سے تبلیغی اجتماعات بھی منعقد کیے جاتے ہیں مگر افسوس ان کا فائدہ اور اثر خطۂ میوات پر خاطر

www.urduchannel.in



خواہ نہیں ہوتا۔ ذرا سا بھی نہیں ہے۔ ان اجتماعات میں تقریر کرنے والے صرف جماعت میں نکلنے اور جان مال کی قربانی کی تلقین کرتے ہیں مگر کبھی علاقائی برائیوں، جہیز تلک، بیٹیوں کی وارثت، ان کو برابر کے حقوق دینے کی بات اور خاندانوں میں موجود لڑائیوں و جھگڑوں میں صلح صفائی کی کبھی تلقین نہیں کرتے۔ چنانچہ یہ جرائم و برائیاں میوؤں میں جوں کی توں رہتی ہیں اور ایک دن کا، دو دن کا یا تین دن کا اجتماع ''نہایت کامیابی'' سے اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ پچاس ساٹھ جماعتیں نکل جاتی ہیں اور کئی ہزار لوگ تبلیغ کے ذمے داروں اور بزرگوں سے مصافحہ کر کے گناہوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ دور سے ہی حضرت جی کو دیکھ کر حصول جنت کے دعوے دار بن جاتے ہیں۔''

''—— تبلیغ کے بنیاد گزاروں کی کوششیں میوؤں کے عقاید، عبادات کی پابندی اور توحید و رسالت کے اقرار و یقین کے باب میں تو کامیاب رہیں، تاہم میوؤں کی اخلاقی، تعلیمی پس ماندگی، ملک و ملت کے تئیں تعاون اور اپنی ذاتی، خاندانی و افرادی ذمے داریوں کے احساس کی بیداری کے تعلق سے بالکل ناکام ثابت ہوئیں۔ میوؤں میں شعور اور دانش مندی نہ پیدا ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ روشن خیال و دانش ور طبقہ اور روشن خیالی کی باتیں میوات میں پسند نہیں کی جاتیں۔ بلکہ روشن خیالوں کو سیدھے لفظوں میں گمراہ اور خدا کا دشمن نیز روشن خیالی کی باتوں کو کھلی گمراہی کہہ دیا جاتا ہے، اس پر لطف کی بات یہ ہے کہ وہ عقل و دانش کی باتوں کو پسند تو کرتے ہیں، غور سے سنتے ہیں اور ان کی داد بھی دیتے ہیں مگر انھیں دل سے قبول نہیں کرتے۔ وہ تو ہم اور کیے، کرائے پر بھی یقین رکھتے ہیں، گھات [جادو، ٹونا] جنوں کے تسلط اور بھوت و پریت کے اثر کا بھی یقین رکھتے ہیں۔ نوین! تمھیں میں ان سے متعلق کچھ کہانیاں سناتا ہوں جو وہاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔''

OO ہمارے گاؤں میں مشہور تھا کہ کوٹھی کے جنگلوں میں رات میں نڑکٹ [ گردن کٹے ہوئے] بھوت، بھوتنی آوازیں نکالتے پھرتے ہیں۔اگر کوئی بدنصیب رات میں وہاں چلا جائے یا اس کا ادھر سے گزر ہوتو وہ اس کا خون پی جاتے ہیں۔اس طرح کے دو تین واقعات بھی سنائے جاتے تھے کہ فلاں گھر کا کوئی رشتے دار، رات میں آرہا تھا،تو بھوت کبھی خطرناک جانور،کبھی چھوٹے سے بچے اور کبھی کتے بلی کی شکل میں آکر اسکے آگے پیچھے ڈولنے [پھرنے] لگے، پہلے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں پایا مگر جب اسے احساس ہوا تو ڈر کے مارے اس کی گھگی بندھ گئی، پھر بہ مشکل اس نے دہائی دے کر ان سے جان بچائی۔کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ بھگا بھگی [ تقسیم کے وقت کی گردی] کے وقت ناحق ماری جانے والی روحیں ہیں جو انصاف کے لیے اب تک تڑپ رہی ہیں۔ان باتوں کو سن کر ہم بچوں کی تو روح کی کانپ جاتی تھی اور آنکھوں میں ڈر وخوف بس جاتا تھا۔''

OO اسی طرح ہمارے گاؤں میں ایک پرانا پیپل کا درخت تھا جس کی جڑوں میں شام کو روٹیاں اور آٹا ڈالا جاتا تھا۔بتایا جاتا تھا کہ اس پیڑ پر دیو بابا رہتے ہیں، یہ روٹیاں اور آٹا ان کے لیے ہے۔ایک بار گاؤں والوں سے بھول ہوگئی اور دیو بابا بھوکے رہ گئے،اس دن گاؤں پر بہت تباہی آئی تھی، کتنی ہی لاشیں گھروں سے نکلی تھیں، پھر کسی کو دھیان آیا کہ دیو بابا کو روٹی نہیں دی گئی۔چنانچہ پورے گاؤں والے گھروں سے روٹی لے کر آئے اور پیپل والے دیو بابا کو روٹیاں دیں،اس کے بعد سے گاؤں پر کوئی آفت نہیں آئی۔

OO کچھ لوگوں نے اپنی زمین میں لگے ایک پیپل کے پیڑ کو کاٹ دیا تھا۔تین دن بعد ان کی منجھلی لڑکی نے شور مچایا کہ میرے جسم میں سید بابا آگئے، وہ مجھے ستا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم لوگوں نے پیپل کو کیوں کاٹا، میرا اس پر گھر تھا۔تم لوگوں نے میرا گھر اجاڑا

www.urduchannel.in



ہے، میرے ایک بچے کو مارا ہے اس کے بدلے میں، میں تیری جان لوں گا۔'' وہ لڑکی شور مچاتی، اِس گھر سے اُس گھر، دیوانی ہوکر بھاگی پھرتی ہے۔اس کے بعد اس کے گھر والوں کے پیپل کی جڑوں کو پانی دینا شروع کر دیا، جس کے بعد سے اس لڑکی کو آرام ہونے لگا۔

OO اسی طرح ہمارے گاؤں کے چھلے کے ویران تکیے کی باتیں بتائی جاتی تھیں کہ ایک نیچ ذات کی عورت بارش سے بچنے کے لیے اس کی چھتری میں داخل ہوگئی۔ابھی وہ باہر کی تیز بارش کو دیکھ ہی رہی تھی کہ تکیے میں موجود قبر سے ایک ہاتھ نکلا جس نے ایک چمٹے میں انگارے کو پکڑ رکھا تھا۔وہ ہاتھ چمٹا لیے ہوئے اس کی جانب ہی بڑھا، جس سے اس غریب کی چیخیں نکل گئیں اور وہ تیز بارش میں ہی دہائیاں دیتی ہوئی نکل پڑی۔اس دن اسے سخت بخار بھی ہوا اور جب تک اس کی جانب سے کچھ پیسہ اس سید بابا کے نام کا صدقہ نہ دے دیا گیا، وہ بخار سے اٹھ نہ سکی۔پتا نہیں یہ روایتیں کس نے گڑھیں اور کس نے ان کو آگے بڑھایا مگر ہم بچوں کے معصوم لاشعور میں یہ باتیں اس طرح بٹھا دی گئیں کہ اب بھی رات میں ان کا خیال آتے ہی روح کانپ جاتی ہے۔

OO اسی طرح بعض کنوؤں کے بارے میں بتایا جاتا کہ ان کنوؤں میں نہیں جھانکنا چاہیے، کیوں کہ ان میں بلائی [خدا جانے بلائی کیا بلا ہوتی ہے] پڑی ہوتی ہے۔وہ جھانکنے والے کو کنویں میں کھینچ لے جاتی ہے اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کی لاش ہی باہر آتی ہے۔ان کنوؤں سے عجیب عجیب آوازیں بھی آتی ہیں۔ان کا مطلب کیا ہے اور کس زبان میں ہوتی ہیں؟ کوئی بھی آج تک نہیں سمجھ سکا ہے۔

OO اسی طرح دونٹوں کی کہانی بھی وہاں بہت مشہور ہے بلکہ اب تک کے بچوں کو سنائی جاتی ہے۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک نٹ اور نٹنی تھے۔وہ ایک رات

جانے کہاں سے آرہے تھے کہ نٹنی کو بچہ ہونے والا درد اٹھا۔مگر بروقت کوئی دائی یا کوئی عورت نہ مل سکی جس سے وہ غریب تڑپ تڑپ کر نٹ کے ہاتھوں میں مرگئی۔اس سے یہ سب دیکھا نہ گیا۔نٹنی کے مرتے ہی اس نے بھی اپنا گلا کاٹ لیا اور پھر وہ دونوں بھٹکتی آتما بن گئے۔یہ بھٹکتی آتمائیں جنگلوں میں آج بھی روتی پھرتی ہیں۔اس لیے بچوں کو اندھیرا ہوتے ہی سو جانا چاہیے۔باہر نکلیں گے تو یہ آتمائیں اٹھالے جائیں گی۔

OO ایک پہاڑ کے بارے میں بتایا جاتا ہے جو''ساس بہو کا پہاڑ'' کے نام سے مشہور ہے۔وہاں تین پتھر ایسے کھڑے ہیں جو دور سے دیکھنے پر انسان کا ہیولہ لگتے ہیں۔ان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ایک دن ایک ماں اور اس کی بہو اور بیٹی،اس پہاڑ پر آئے۔اچانک ساس کے منہ سے نکلا:''یا اللہ تُو ایسو کہان ہے جو ہمن نے پھتر کا بنادے!'' [یا اللہ تو ایسا کہاں ہے جو ہمیں پتھر کا بنادے] اسی وقت اللہ نے ان کی دعا قبول کرلی اور وہ پتھر کی بن گئیں۔''

''—— یہ کہانی پورے علاقے میں ایسی مشہور ہے کہ مرد و عورتیں، بچے و بوڑھے دور دور سے اس پہاڑ کو دیکھنے آتے ہیں اور ان پتھروں کو ہاتھوں سے چھو کر اپنے منہ اور سینے پر پھیرتے ہیں اور ان سے مقدس مریم و اس کے بیٹے کی مانند مرادیں مانگتے ہیں۔منتیں مانتے ہیں اور ان کے نام کے دھاگے کلائیوں اور بازوؤں پر باندھتے ہیں۔''

OO وہاں ایک توہم اور ہے۔جب گرمیوں کے دنوں میں خالی کھیتوں یا کھلیانوں میں ریت اڑتی پھرتی ہے اور وہ ارتعاش مچاتی ہوئی گول گول جھکھجھور بنادیتی ہے،اسے میواتی زبان میں 'بھبھولا' کہا جاتا ہے۔ریت کے جھکھجھور بنتے وقت اس میں چپل یا جوتی مارنے سے،مارنے والے کو ایک زوردار طمانچہ پڑتا ہے۔اسی طرح کبھی کبھی پیسے بھی ملتے ہیں۔''

www.urduchannel.in



رات کے گہرے سناٹے میں جب میں نے یہ باتیں کہیں تو نوین ان باتوں کو سن کر سہم سا گیا،اس کے چہرے پر کھنچنے والی لکیریں یہی بتا رہی تھیں۔جیسے اس کے علاقے میں بھی اس طرح کی کوئی روایت یا کہانیاں موجود ہوں اور اسے وہ یاد آ کر رہ گئی ہوں،مگر میں نے اس سے کچھ پوچھا نہیں۔آخری توہم پر وہ ہنس پڑا،بھلا جھکھجھور میں سے کیسے پیسے مل سکتے ہیں یا کوئی کیسے طمانچہ جڑ سکتا ہے۔مگر واہ رے توہم،وہ دیر تک ہنستا رہا۔پھر ہوش بجا کر کے کہنے لگا:

''—— اچھا اگر ایسا ہے تو پھر وہاں کی کچھ لوک کہانیاں بھی ہوں گی،سناؤ...سناؤ...سناؤ... وہ ضد کرنے لگا۔رات گہری ہوتی جارہی تھی اور ہم دونوں اپنے اپنے بیڈ پر دراز ہوگئے تھے۔میں نے لیٹے لیٹے ہی نوین کو کچھ لوک کہانیاں سنائیں۔

## OO پہلی کہانی:۔

''—— ایک کوا اور دھولا [ کبوتر کی نسل کا ایک پرندہ جس کی گردن میں کالا کالا قدرتی ڈورا ہوتا ہے جو''کُو کُوک کُو.....کُو کُوک کُو'' کی آواز نکالتا ہے،اسے فاختہ بھی کہا جاتا ہے] دونوں دانا چگنے زمین پر اترے۔کوے کو ملا دانا جو اس نے فوراً کھالیا اور دھولا کو ملا موتی،جو اس نے سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا۔دھولا نے کوے سے پوچھا:

''—— کوے...کوے! تجھے کیا ملا؟'' تو اس نے بتایا

''—— مجھے دانا ملا۔''

''—— اور تجھے؟'' کوے نے دھولا سے پوچھا۔

''—— مجھے موتی ملا!'' دھولا نے جواب دیا۔

''—— ذرا دکھاؤ تو'' کوے نے کہا تو اس نے دے دیا۔کوے کی نیت خراب ہوئی اور

وہ موتی لے کر اڑا اور پاس کے پیڑ پر بیٹھ گیا۔

''—— یہ دیکھ کر دھولا رونے لگی، روتے روتے اس نے کوے سے کہا: کوے...کوے موتی مجھے دے دو!''

''—— میں کیوں دوں؟'' کوے نے جواب دیا۔ جسے سن کر دھولا نے ڈالی سے کہا:

''ڈالی، ڈالی کو اڑا!''

''—— میں کیوں اڑاؤں؟'' ڈالی نے کہا۔

''—— کوا موتی لے گیا، اب دیوے نا'' دھولا نے کہا تو، ڈالی نے پھر بھی منع کر دیا۔

یہ سن کر وہ کلہاڑی کے پاس گئی اور اس سے کہا کہ:

''—— کلہاڑی، کلہاڑی، تُو اس ڈالی کو کاٹ دے!''

''—— کیوں؟'' کلہاڑی نے پوچھا۔

''—— میں نے ڈالی سے کہا، ڈالی کو اڑائے نا، کوا موتی لے گئو اب دیوے نا''

یہ سن کر بھی کلہاڑی نے منع کر دیا تو دھولا آگ کے پاس گئی اور اس سے کہا:

''—— آگ آگ تو کلہاڑی کو جلا!''

''—— کیوں؟'' آگ نے پوچھا۔

''—— ڈالی کو اڑائے نا، کلہاڑی ڈالی کاٹے نا، کوا موتی لے گئو اب دیوے نا''

یہ بات سن کر بھی آگ نے منع کر دیا تو وہ پانی کے پاس گئی اور اس سے کہا:

''—— پانی پانی آگ بجھا!''

''—— کیوں؟'' اس نے پوچھا

''—— ڈالی کو اڑائے نا، کلہاڑی کو اکاٹے نا، آگ کلہاڑی جلائے نا، کوا موتی لے گئو

www.urduchannel.in



اب دیونا۔''

دھولا کی یہ بات سن کر پانی نے بھی منع کر دیا، تو دھولا گائے کے پاس گئی اور اس سے کہا:

''—— گائے گائے، پانی پی!''

''—— کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''—— ڈالی کو اڑائے نا، کلہاڑی ڈالی کاٹے نا، آگ کلہاڑی جلائے نا، پانی آگ بجھائے نا، کوا موتی لے گئو اب دیوے نا۔''

اس کی یہ بات سن کر گائے کو رحم آ گیا اور اس نے پانی پینے کی بات مان لی، گائے کا ارادہ دیکھ کر پانی نے آگ کو بجھانے کی بات مان لی، پانی کی پلٹی دیکھ کر آگ نے کلہاڑی جلانے کی بات مان لی، آگ کے تیور دیکھ کر کلہاڑی نے ڈالی کاٹنے کی بات مان لی، ڈالی نے کو اڑانے کی بات مان لی اور کوے نے دھولا [فاختہ] کا موتی لوٹا دیا۔''

کہانی ختم، اس کے بعد اکثر ہم بچے سوجاتے اور یہ سوال اب تک ذہن میں موجود ہے کہ یہ سب معاملہ الٹا کیسے ہوگیا اور کیسے وہ اس معصوم دھولا کو پریشان کرنے والے ایک ایک کر کے اس کی مدد کرنے کو تیار ہوگئے۔ بہر حال یہ معمہ، اب تک معمہ ہی ہے۔

## OO دوسری کہانی:۔

ایک راجہ کے سات بیٹیاں تھیں۔ ایک دن اس نے ان سب کو اپنے خاص محل میں جمع کر کے کہا:

''—— بیٹیو! یہ بتاؤ تم کس کے مقدر کا کھاتی ہو، یا آگے کھاؤ گی؟''

اس کے جواب میں چھے بیٹیوں نے تو کہہ دیا:

''—— راجہ بابا، ہم تیرے ہی مقدر کا کھاتے ہیں اور آگے بھی کھائیں گے——'' مگر

ایک بیٹی نے کہا کہ ''میں تو اپنے مقدر کا کھاتی ہوں اور آگے بھی اپنے مقدر کا کھاؤں گی۔۔۔''

اس کا یہ جواب سن کر راجہ بابا بہت ناراض ہو گیا اور جب ان بیٹیوں کی شادی کا وقت آیا تو اس نے چھے بیٹیوں کی شادی تو دوسرے ملکوں کے شہزادوں سے اور اچھے گھرانوں میں کرادی مگر اس ساتویں بیٹی کی شادی ایک کوڑھی، بیمار اور غریب آدمی سے کر دی۔ اس کے بعد چھے بیٹیاں تو عیش و آرام میں رہنے لگیں اور وہ ساتویں بیٹی پریشانی اور مشکل میں اپنے کوڑھی اور بیمار شوہر کی خدمت کرتی رہی۔ دن ایسے ہی گزرتے رہے۔ ایک دن ساتویں بیٹی کو ایک فقیر نے دو پڑیا ئیں دیں اور اس سے کہا:

''۔۔۔ بیٹی! ایک پڑیا کو اپنے گھر کے چاروں کونوں میں ڈال دینا، وہاں سے تمھیں خزانہ ملے گا اور دوسری اپنے شوہر کو پلا دینا، اس کا کوڑھ اور بیماری ٹھیک ہو جائے گی۔''

ساتویں بیٹی نے ایسا ہی کیا تو دوسرے دن اس کے گھر کے کونوں میں سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات، موتی پڑے تھے، اسی طرح اس کا شوہر بھی کوڑھ و بیماری سے ٹھیک ہو کر خوب صورت نوجوان بن گیا۔ دوسری طرف ان چھے بیٹیوں کے برے دن شروع ہو گئے، ان کے گھروں میں کنگالی آ گئی، ان کے شوہر ناکارہ اور نکمے نکل گئے۔ اسی طرح ان بیٹیوں کے باپ یعنی راجہ بابا کے ملک پر پڑوس کے راجہ نے اس کے وزیروں سے مل کر حملہ کر کے اسے ہرا دیا اور اس کا سارا خزانہ لوٹ لیا۔ وزیر غدار نکل گئے اور انھوں نے محل اور راجہ کی دوسری جائدادوں پر قبضہ کر لیا۔ وہ راجہ کسی طرح جان بچا کر جنگلوں میں بھاگ گیا، پھر ایک دن بھٹکتے بھٹکتے ساتویں بیٹی کے گھر پہنچ گیا۔ بیٹی کے شان دار گھر اور شوہر کو صحت مند دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بیٹی نے باپ کو پہچان لیا اور پھر اس سے کہا:



''۔۔۔ راجہ بابا، یہ ہے میرا اپنا مقدر، جس سے میں نے پہلے بھی آپ کے محل میں کھایا تھا اور اب بھی کھاتی ہوں۔''

یہ سن کر راجہ بابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے بیٹی سے معافی مانگی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ڈھیروں دعائیں دیں، پھر اس کی دوسری بہنوں کی بری حالت اور اپنی بربادی کے بارے میں بتایا، تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے بعد اس نے راجہ بابا اور بہنوں کی دل کھول کر مدد کی۔''

## oo تیسری کہانی:۔

ایک چڑیا اور ایک بھینس کا یارانہ تھا۔ وہ اکثر ساتھ ساتھ رہتیں، بھینس نیار [چارا] کھاتی اور چڑیا دانے چگتی۔ دانہ چگ کر وہ بھینس کی پیٹھ پر بیٹھ کر مزے کرتی۔ جہاں بھینس جاتی وہ بھی اس کے ساتھ آتی جاتی۔ ایک دن چڑیا نے بھینس سے کہا:

''۔۔۔ بھینس... بھینس میں تیری پیٹھ پہ بیٹ کر دوں؟'' بھینس نے ہنس کر اجازت دیدی تو چڑیا نے بیٹ کر دی۔ پھر کسی دوسرے دن بھینس نے چڑیا سے یہی بات کی:

''۔۔۔ چڑیا... چڑیا میں تیرے اوپر گوبر کر دوں؟'' چڑیا نے بھی اجازت دے دی۔ بھینس نے گوبر کر دیا جس میں چڑیا دب گئی۔ گوبر کرنے کے بعد بھینس وہاں سے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہاں ایک گیدڑ آیا اور گوبر کو سونگھنے لگا۔ اس کی سوں سوں سن کر چڑیا کہنے لگی۔

''۔۔۔ سونگھا سانگھی کیں کرے، اکھاڑے کھائے نے [سونگھنا بند کر کے مجھے اس میں سے نکال کر کھالے] چنانچہ گیدڑ نے ایسا ہی کیا، گوبر سے اسے نکال کر کھانے کا ارادہ کیا تو وہ کہنے لگی:

''۔۔۔ گندی سندی کیں کھائے، دھووَ رکھائے نے [گندی سندی کیوں کھاتا ہے، مجھے

www.urduchannel.in

دھل کر کھا] گیدڑ نے اس کی بات مان کر پاس کے گڑھے میں اسے دھویا اور کھانے کا ارادہ کیا تو چڑیا بولی:

''—— آلی گیلی کیں کھائے، سوکھار کھائے نے [ گیلی گیلی کیوں کھاتا ہے مجھے سوکھا کر کھا] گیدڑ نے اس کی بات مانتے ہوئے اسے پاس کی چھان / چھپر پر سوکھنے کے لیے پھینک دیا۔ چڑیا کے پر سوکھے اور وہ پھُر سے اڑ کر پاس کے کیکر کے پیڑ پر جا بیٹھی اور گیدڑ کو چڑھانے لگی۔ گیدڑ کو اس پر بہت غصہ آیا مگر چوں کہ سب غلطیاں اس نے ہی کی تھیں اور چڑیا کی باتیں مانتا چلا گیا، اس لیے اب پچھتانے کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔''

نوین ان کہانیوں کو سن کر عجیب سا محسوس کر رہا تھا جیسے اسے بھی اپنا بچپن یاد آ گیا ہو اور اسے بھی چند کہانیاں یاد آ گی ہوں۔ یہ کہانیاں ختم ہوئیں پھر تھوڑی دیر بعد ہم سو گئے۔ کمرے کے باہر سناٹوں کے قافلے آ جا رہے تھے اور رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ رات گزرتی رہی۔ پھر کہیں دور سے سپیدۂ سحر طلوع ہوا جو بڑھتے بڑھتے پوری رات کو روشن کر گیا۔ شام کے وقت میں، میں اور نوین، پھر رنگ روڈ پر تھے اور میوات کی کہانیاں جاری تھیں۔

''—— اچھا ٹھیک! لڑکیوں اور لڑکوں متعلق میوات میں کیا تصورات ہیں، یعنی.....''

''بس بس.... یار میں سمجھ گیا، اب چپ چاپ سنو۔'' میں نے نوین کو بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ کہیں پاس سے آنے والے مور کی لمبی سی آواز اس پورے ماحول کو مترنم کر گئی۔

''—— ایک میواتی شاعر کہتا ہے:

بیٹا سو بیٹی بھلی، جے کل ونتی ہوئے!
بیٹو تارے ایک کل، بیٹی تارے دوئے!!

[بیٹے سے بیٹی اچھی، جو پوری مالک ہوتی ہے۔ بیٹا ایک تارہ ہے اور بیٹی دو تارے]

www.urduchannel.in



اس کے باوجود بھی میوات میں لڑکیوں کی پوزیشن اچھی نہیں ہے۔ ان کی پیدائش پر آج بھی میوات کی خواتین اور مرد، منہ ٹیڑھا کر لیتے ہیں اور لڑکوں کی پیدائش پر نہ صرف جشن منائے جاتے ہیں اور گھر گھر مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں، بلکہ ان کے عقیقے بھی دھوم دھام سے کیے جاتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام میں لڑکیوں کے عقیقے کا بھی حکم ہے۔''

''—— عقیقے والے دن گھر کے صحن میں ایک چوکی یا گھر کے شاندار پلنگ پر بٹھا کر لڑکے کو سلامی دی جاتی ہے جس میں اس کی ماں، بڑی بہن، چچی، تائی، پھوپھی، آس پاس گھروں کی عورتیں، نوعمر لڑکیاں شیشہ، کنگھا، رومال، کاجل کی ڈبیا، سینٹ، پرفیوم وغیرہ گفٹ میں دے کر اس کو بلائیں لیتی ہیں اور اس کو درازیٔ عمر کی دعا دیتی ہیں۔ کسی کسی کو تو نانی، مائیں، دادی پھوپھیاں انعام میں سونے کا بنا ''ڈُھلنا'' [ایک قسم کا گول زیور جسے گلے میں پہنتے ہیں] یا تعویذ پہناتی ہیں جسے وہ تاعمر گلے میں ڈالے رہتا ہے۔ رشتے داروں اور مہمانوں کو اس دن بکرے کا گوشت کھلانا شگون مانا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک تازہ بکرا ذبح کیا جاتا ہے اور کسی میٹھے پکوان مثلاً کھیر یا زردے کے ساتھ دعوت اڑائی جاتی ہے۔ اسی دن لڑکے کے بال اتارے جاتے ہیں اور ان کے برابر چاندی یا اس کی قیمت، غریبوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ کہیں کہیں اس کے نام سے مسجدوں میں **101** روپے بھی دیے جاتے ہیں۔ اس طرح سے وہ معصوم ان کے گمان وعقیدوں کے مطابق، مصیبتوں اور آفتوں سے بچ جاتا ہے۔''

''—— بیٹی اور بیٹے کے درمیان امتیاز اور فرق بچپن سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ بیٹیوں کے ذہن میں ماؤں کے ذریعے شروع سے ہی یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ تم اس گھر میں اپنے باپ اور بھائیوں کے رحم وکرم پر ہو، ان سے کبھی کسی معاملے میں الجھنے یا بحث کرنے

کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھیں جو یہاں مل جائے اسے باپ اور بھائیوں کا احسان مان کے رکھ لینا ہے۔ وغیرہ—— دوسری بات یہ کہ بیٹوں کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ کمانے دھمانے والے بنیں گے، گھر کے ذمے دار اور وارث بنیں گے، اسی طرح یہ جہیز لائیں گے، جب کہ بیٹیاں شروع لے کر آخر تک، اسی طرح پرائے گھر جانے تک خرچے ہی کرائیں گی، بھاری بھاری جہیز دے کر ان کو رخصت کرنا ہوگا اور اس کے بعد ان کے سسرال والوں کی طرف سے ان کی ہر فرمائش پوری کرنی ہوگی۔ بیٹیوں کے لیے صرف عید، بقرعید کے موقع پر ہی کپڑے آتے ہیں، وہ بھی ان کی پسند نہ پسند اور مرضی نامرضی جانے پوچھے بغیر، جیسا آ جاتا ہے، ان کو پہننا ہی پڑتا ہے۔ اگر وہ اعتراض کریں یا ناپسندیدگی کا اظہار کریں تو انھیں ایسی ایسی باتیں سنائی جاتی ہیں کہ اللہ توبہ۔ جب کہ بیٹا جب چاہے باپ سے فرمائش کر لیتا ہے جسے وہ ''اسی کے لیے تو کما رہے ہیں'' کہہ کر پورا کرنا اپنی سب سے پہلی ذمے داری سمجھتا ہے۔ اسی طرح ہر کپڑے، ہر پہننے اوڑھنے کی چیز میں اس کی مرضی نامرضی اور پسند ناپسند کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ لڑکوں کو بغیر بتائے کہیں بھی آنے جانے کی چھوٹ ہے اور لڑکیوں کو گھر سے کچھ دور جانے پر بھی ''اجازت'' لینی ہوتی ہے۔ لڑکا چاہے کیسے ہی کپڑے پہنے مگر لڑکیوں کے لیے چھوٹی عمر سے ہی پردہ لازمی کر دیا جاتا ہے جسے گھر کی چار دیواری میں بھی اتارنے کی اجازت نہیں ہوتی، چنانچہ وہ سوتے جاگتے، کھیلتے کودتے، چلتے پھرتے وقت سر باندھے رہتی ہیں۔ اگر غلطی سے دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا، تو ماں یا بھائیوں کی خونخوار نگاہیں بہت جلد دوپٹے کی حالت سدھار دیتی ہیں۔ تاہم یہی عادت آگے چل کر ایسی بنتی ہے کہ جب ان لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے تو سسرال میں وہ سسر، جیٹھ، (خاندانی یا گاؤں بستی کے) اور ہر اجنبی کو دیکھتے ہی لامبا لامبا گھونگھٹ

www.urduchannel.in



کھینچ لیتی ہیں، ان کا چہرہ کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔''

''—— لڑکیوں کے ساتھ زیادتیوں کے قصوں سے پوری میوات بھری پڑی ہے۔ کوئی ایک یا انوکھا واقعہ ہو تو بیاں کروں، چپے چپے پر وہاں ایک نیا واقعہ ان معصوموں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اسے وہاں کے لوگ، فخر اور شان کی بات بھی سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی بیٹیوں کا کتنا کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔ ماں باپ اور گھر کے دوسرے بڑوں کی طرف سے یہ امتیاز اور فرق بہت حد تک ان دونوں اولادوں کے درمیان ڈال دیا جاتا ہے۔ جس کا نفسیاتی اور لاشعوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں بہن بھائیوں والا پیار اور خلوص باقی نہیں رہتا۔ بھائی اپنی بہنوں کو بوجھ سمجھنے لگتے ہیں اور بہنیں انھیں اپنا دشمن تصور کرتی ہیں۔ چنانچہ ان کا معمولی بحث ومباحثہ بسا اوقات شدید لڑائی اور ایک دوسرے کو مارنے پیٹنے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت بھی ماں باپ اور گھر کے بڑے، بیٹے کی حمایت کرتے ہوئے بیٹی کو ہی برا بھلا کہتے ہیں اور اسے لڑکوں کے معاملے میں دخل دینے سے سختی سے منع کرتے ہیں۔ اپنے ہی گھر میں اپنی یہ پوزیشن محسوس کر کے وہ معصوم بچپن سے ہی چار چار آنسو رونے لگتی ہے۔ بسورتی ہے، کئی کئی دن تک کھانا نہیں کھاتی، سخت چڑچڑی ہو جاتی ہے اور ہر کسی کو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔''

''—— وہاں لڑکیوں کی یہ گت بھی بنتی ہے کہ باپ ہو یا ماں، بھائی یا کوئی اور، سب کام ان سے ہی کرنے کے لیے کہتے ہیں یا رواجاً امید رکھتے ہیں، جب کہ لڑکوں سے معمولی کام کرنے کو بھی نہیں کہا جاتا بلکہ ان کا شہزادوں کی طرح خیال رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اکثر یہ لاڈ پیار وہاں کے لڑکوں کو اس بری طرح بگاڑ دیتا ہے کہ وہ ماں باپ کی ہی جان کو آ جاتے ہیں۔ ان سے ہی لڑائی کرتے ہیں اور انھیں گالیاں بھی دیتے ہیں۔ پھر وہ ماں باپ ہر ملنے جلنے والے سے کہتے ہیں کہ ''ہماری اولاد بگڑ گئی، ہمارے لڑکے غلط نکل گئے ...ہماری تو

قسمت ہی پھوٹ گئی۔'' اور پھر وہ تیز تیز رونے لگتے ہیں مگر اس وقت کوئی ان کی دادرسی نہیں کرتا اور نہ ان کے آنسو پونچھتا ہے۔ جو بھی سنتا ہے، کوئی تو ان میں خوش ہوتا ہے اور کوئی بس چپ رہتا ہے۔''

''—— اس کے علاوہ لڑکوں کا یہ بگاڑ گھر اور محلے بھر کے لیے بھی مصیبت اور پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ گھر والوں کے دم پر محلے بھر سے لڑائی جھگڑا کر کے اپنے گھر اور خاندان کو بدنام کرتے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی ان لاڈلوں کی کرتوتوں سے کئی کئی نسلوں کی دشمنیاں، لڑائیاں اور جھگڑے چھڑ جاتے ہیں۔ ان حالات کے باوجود بھی وہاں کوئی لڑکی باغی نہیں ہوتی اور نہ ہی اپنے ساتھ ہونے والی کسی بھی قسم کی زیادتی پر آواز اٹھاتی ہے۔''

''—— یہ صورت حال گزرتی رہتی ہے اور لڑکی بڑی ہو جاتی ہے پھر اسے ماں یا بڑی بہن کے ساتھ گھر بھر کے کاموں، کھیتوں سے چارہ، گھاس لانے اور چھوٹے بچوں کو گودی کھلانے پر لگا دیا جاتا ہے جب کہ اسی عمر کا لڑکا اپنی بہن پر حکم جماتا ہے، اسے بہت پہلے سے ہی گھر اور زمینوں کا وارث مان لیا جاتا ہے چنانچہ اس کی تربیت ناز و نخروں والے انداز میں ہوتی ہے اور لڑکی، کاموں میں گھستی پٹتی، منحنی سی نہ جانے کب جوان ہو جاتی ہے اور پھر گھر کے مرد، ایک دن جمع ہو کر اس کی شادی کے لیے آپس میں مشورہ کرتے ہیں یا اسی دوران میں کوئی شخص ان کو بتلاتا ہے کہ فلاں گاؤں میں کوئی لڑکا ہے، اس کے حصے میں اتنی بیگھہ / اتنے کلہ زمین آ رہی ہے، اور وہ...

اس کے بعد اس کو کچھ نہیں کہنے دیا جاتا، لڑکا پسند آ جاتا ہے اور اس کے بتائے ہوئے گاؤں میں باپ، بھائی اور دوسرے رشتے دار اجتماعی طور پر اپنے کاندھوں کے اس بوجھ کو بھاری بھرکم یا بساط بھر جہیز دے کر پھینک آتے ہیں۔ کیوں کہ وہاں فرسٹ، سیکنڈ تھرڈ، کسی بھی کیٹیگری کے کزن

www.urduchannel.in



برادرس، سسٹرز کی آپس میں شادیاں نہیں ہوتیں، وہاں اس طرح کی سوچ اور بات کو گناہ عظیم تصور کیا جاتا ہے۔ چچا، تائے، پھوپھی کے بچے، آپس میں سگے بھائی بہن سمجھے اور مانے جاتے ہیں لہٰذا بچپن سے ہی ان کی جانب اس طرح کا نہ تو رجحان ہوتا ہے اور نہ اس طرح کے جذبات ان کے دلوں میں ابھرتے ہیں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ ماں اپنی بھتیجی یا بھانجی اپنے بیٹے کے لیے لے آئے۔ اس کے بعد وہ ساس بن جاتی ہے اور اپنے ہی خون کو تگنی کا ناچ نچا دیتی ہے۔ جب وہ ساس بن جاتی ہے، اس وقت اسے یاد نہیں رہتا ہے کہ بہو اس کے بھائی یا اس کی بہن کی بیٹی ہے۔ بس اس کے لیے تو وہ بہو ہے اور ساس بہو کی آپسی رشتہ داریاں جو برصغیر میں ہیں، ان کے متعلق تو کہنا ہی کیا...!

''—— ہاں! تو بات چل رہی تھی اس معصوم لڑکی کی۔ اپنی سسرال کے گاؤں کے اجنبی خاندان کے گھر میں وہ لڑکی خونخوار ساس، کینہ پرور نند، ہوس کار دیور، ناکارہ اور نکمے شوہر کے بیچ اس طرح پھنس جاتی ہے جیسے بتیس دانتوں کے بیچ میں زبان ہوتی ہے۔ ذرا سی اِدھر، اُدھر ہوئی، کہ کٹی۔ اسے قدم قدم پر اپنے خاندان، گاؤں، علاقے اور اپنے نام کا تحفظ کرنا ہوتا ہے، پھر بھی ساس اور نندیں اسے کسی نہ کسی بہانے سے تنگ ہی کرتی رہتی ہیں، اس سے دوستی کرنے کے بجائے پہلے دن سے ہی اس سے دشمنی گانٹھ لیتی ہیں۔ روز اول سے ہی اس پر نگاہیں رکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ معمولی معمولی بات پر اسے کوسنے اور طعنے سناتی ہیں اور ماں باپ کی تربیت پر تیکھے حملے کرتے ہوئے اس کے خاندان کے بزرگوں تک کو بکھان ڈالتی ہیں، خوب گڑے مردے اکھاڑے جاتے ہیں۔ جس سے وہ معصوم تلملا ہی تو اٹھتی ہے مگر اس وقت بے بسی اور لاچاری، اس کی چادر بن کر اسے ڈھانپ لیتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر بہت روتی ہے اور جب آنسوں اس کی شباب آنکھوں سے

بہہ کر گلاب چہرے پر لکیر بناتے ہوئے سوکھ جاتے ہیں تو وہ اپنی بپتا اپنے میکے والوں کو سناتی ہے، تو بجائے اس سے ہمدردی کے، الٹا اسے ہی قصوروار ٹھیرا کر معاملے کو سدھارنے اور ''قسمت کے لکھے'' پر صبر کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، جسے وہ معصوم زہر کا گھونٹ پی کر سہہ جاتی ہے۔''

اچانک رنگ روڈ کے اندھیرے موڑ پر دو بائکس آپس میں ٹکراتے ٹکراتے بچیں۔اس پر دونوں بائکرس ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور ایک دوسرے کی غلطی بتانے لگے۔پھر اس سے پہلے کہ بات اور بڑھتی، پورواانچل زون کے سکیوریٹی گارڈوں نے معاملے کو ٹھنڈا کر دیا۔دونوں بائکرس ایک دوسرے کو آنکھیں دکھاتے ہوئے چلے گئے۔شام کا سورج لال ہو رہا تھا، اس کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی اور ہماری واکنگ وٹاکنگ کا سلسلہ ایک بار پھر جاری ہو گیا۔

''—— نوین! اب تو وہاں کی لڑکیاں ان حالات کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ کوئی ''نسائی تنظیم''[Woman Organization] اور ''فلاحی مہم''[Wellfear Moments] کے لوگ اس ظلم و زیادتی کے خلاف ان سے آواز اٹھانے کے لیے یا کمیشن اور وزارت میں اس کی شکایت کرنے کے لیے کہیں بھی تو، وہ برا مان جاتی ہیں اور اسے اپنی خاندانی پہچان و شناخت سے جوڑ لیتی ہیں اور انھیں وہاں سے دوڑا دیتی ہیں۔''

''—— کبھی کبھی بات برداشت سے آگے بڑھ جاتی ہے اور میاں بیوی آمنے سامنے آجاتے ہیں اور پھر وہ سر پھٹول مچتا ہے کہ ہائے توبہ! ہائے اللہ! اس میں ہار بھی بیوی کی ہوتی ہے۔پورے گھر میں سوگ کا سا ماحول پسر جاتا ہے۔میاں بیوی کی یہ لڑائی دونوں گاؤں کے خاندانوں میں دور دور تک مشہور ہو جاتی ہے اور وہاں کی عورتیں اس طرح باتیں

www.urduchannel.in



بناتی ہیں جیسے یہ لڑائی پہلی بار ہوئی ہو، ایک ایک جز، ایک ایک بات، مزے لے لے کر بیان کی جاتی ہے اور انداز ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کہنے والی اس دنیا کی پارسا ترین عورت ہو اور اس نے کبھی سسرال میں لڑائی نہ کی ہو۔وہ ان باتوں میں کچھ باتیں اپنی طرف سے بھی ملا دیتی ہیں۔لڑائی کے وقت چند ہمدرد عورتیں گھر میں یا منڈیروں پر آجاتی ہیں اور اس مظلوم کو تسلیاں دیتی ہیں، ان تسلیوں پر اس کا تاثر اس وقت بیدی کے افسانے ''ایک چادر میلی سی'' کی 'رانو' کا سا ہو جاتا ہے۔چنانچہ کہنے والیاں اپنے ماتھوں پر ہاتھ مار کر رہ جاتی ہیں۔ ''اس سے تو خدا ہی سمجھے!'' [ کرب کی گہری لکیریں ان کی پیشانیوں پر بن جاتی ہیں پھر وہ بڑبڑاتی ہوئیں اپنے گھروں کو چلی جاتی ہیں ] .....

میں نوین کو بتا رہا تھا——

''—— وراثت میں زمین، صرف بیٹوں کو ملتی ہے اور بیٹیوں کو اس کے بدلے جہیز دے کر معاف کرالی جاتی ہے یا ان سے بھائی اور بھاوجیں ہمیشہ کپڑا، لتا دینے کا وعدہ کر لیتے ہیں، بہن/ بہنیں بھی اس پر راضی ہو کر اپنا حق چھوڑ دیتی ہیں۔اگر کبھی کوئی بہن یا بیٹی قانون یا عدالت کی بات کہہ کر اپنا حق مانگنا چاہتی ہے تو اسے پنچایت کے ذریعے دھمکایا اور سمجھایا جاتا ہے۔اس کی ضد کو غلط اور سماج سے بغاوت کہا جاتا ہے...!

''—— فرزانہ کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔اس کے باپ اور بھائیوں نے اس سے زمینوں میں حصہ داری معاف کرنے کے لیے کہا تو اس نے صاف منع کر دیا۔دراصل اس کا شوہر شہر میں رہتا تھا اور ایک دو وکیل اس کے دوست بھی تھے۔فرزانہ کے شوہر شکیل نے ان سے بات کی تو وکیلوں نے کہا کہ ہم قانونی لڑائی لڑ کر تمھاری بیوی کا حصہ دلائیں گے۔ فرزانہ کے اس منع کرنے کی بات پورے علاقے میں پھیل گئی۔اس خبر کا پھیلنا تھا کہ علاقے

کے پانچ چھے گاؤں کے بیچ میں پڑے لمبے چوڑے میدان میں پنچایت بلائی گئی۔اس میں مرد،عورتیں اور بچے بھی آئے تھے۔فرزانہ،شکیل اور اس کے وکیل دوستوں کو بھی بلایا گیادوسری پارٹی پنچوں کی تھی۔جن کی آنکھوں میں بے حد غصہ اور پیشانیوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔''

''——پورو مالمو پھر سو بیان کرو جائے...''[پورا معاملہ پھر سے بیان کیا جائے!] پنچوں نے اعلان کیا تو ان کے اردلیوں نے روایتی انداز میں تیز آواز میں یہ بات پورے مجمع تک پہنچائی۔''

''——تاؤ،میرو نام فرزانہ اے...''[تاؤ میرا نام فرزانہ ہے] مدعی لڑکی عورتوں کی بھیڑ میں سے نکل کر بولنے لگی۔

''——میں نے اپنا حصہ کی جمین اپنا باپ کا مل اور بھائین سو مانگی تو ان نے پہلے تو ساپ نائی کر دی، پھر جب میں نے جادہ کہی تو ان نے ماف کرنا کی بات کی کہی پر مو ہے تو میرو حصو چہیے....!''[میں نے اپنے حصے کی زمین اپنے باپ اور بھائیوں سے مانگی تو انھوں نے پہلے تو صاف منع کر دیا، پھر جب میں زیادہ کہا تو انھوں نے معاف کرنے کی بات کہی، لیکن مجھے تو میرا حصہ چاہیے!] فرزانہ نے اپنا مدعا خود ہی بیان کیا۔وہاں کوئی وکیل یا ایڈوکیٹ نہ تو مدعا بیان کرتا ہے اور نہ ہی کیس لڑتا ہے۔''

''——اچھو....!''[اچھا] پنچوں نے اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

''——پر بٹی!ایسو مطالبو تو آج تک ہماری کائی باہن/بٹی نے نہ کرو، تو ہے تو خوب پتو ہے کہ ہمارے ہین تو یا کو رواج ہی نا اے، تو سو یہ سہی تو نائی کر رائیں۔تو ایسو کر کے سہی نا کرری، تیر باپ ا بھائین نے تیرا بیا میں کتنو خرچو کرو، تو لو جہیج دیو اور پھر پوری جندگی



تیرا سر پہ ان کو ہات اے، پھر بیٹا تو کائیں لوجد کر رری اے۔ بٹی تیرا حق میں بہتر یہی اے کہ تو یا جدا ے چھوڑ دے نہیں تو اچھی بات نا ہوئے گی...[لیکن بیٹی!ایسا مطالبہ تو آج تک ہماری کسی بہن یا بیٹی نے نہیں کیا، ہمارے یہاں تو اس کا رواج بھی نہیں ہے۔تم سے یہ ٹھیک ہی تو منع کر رہے ہیں۔تم ایسا کر کے درست نہیں کر رہی ہو۔تیرے باب بھائیوں نے تیری شادی میں کتنا خرچہ کیا تھا، تجھے جہیز بھی دیا اور پھر پوری زندگی تیرے سر پر ان کا ہاتھ ہے۔بیٹا تم کیوں ضد کر رہی ہو۔بیٹی تیرے حق میں تو یہی بہتر ہے کہ تم اس ضد کو چھوڑ دو، ورنہ اچھی بات نہیں ہوگی] اپنا یہ فیصلہ سنا کر پنچ وہاں سے اٹھ گئے اور پوری پنچایت گاؤں میں سما گئی۔''

''——وہاں بیٹیوں اور بہنوں کا حق ایسے ہی مارا جاتا ہے اور پوری زمین بھائیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔جس کے وہ ٹکڑے بخرے کر کے باپ دادا کی نشانی کو جوئے، سٹے، قرض، لون، رہن میں رکھ کر برباد کر دیتے ہیں۔یہی بھائی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے لیے اپنے ہی سگے بھائیوں کا بے رحمی سے کبھی لاٹھیوں سے قتل کر دیتے ہیں ،کبھی انھیں گولیوں سے بھون کر ان سے زمینیں چھین لیتے ہیں۔مجھے اپنے گاؤں کے وہ بڑے بڑے کھیت یاد ہیں جن کا مالک ایک ہی ہوتا تھا، ان میں کوئی فصل کتنی اچھی لگتی تھی مگر اب وہی لمبے لمبے کھیت چھے سات ٹکڑوں میں بٹ کر خود اپنی بے بسی اور بربادی پر آنسو بہاتے ہیں۔''

یہاں آ کر میری سانسیں تیز ہو گئیں، مجھے میرے گاؤں کے پاس پیش آنے والے دو تین واقعات یاد آنے لگے۔میں انھیں یاد کر کے اندر ہی اندر لرز گیا۔اف خدایا، وہ کتنا خطرناک منظر تھا۔پھر میں نے کہنا شروع کیا۔

www.urduchannel.in

''—— نوین! تمھارے بارے میں تو مجھے نہیں پتا، مگر جب کبھی میں ایسی خبریں سنتا ہوں تو حیرانی سے سوچتا ہوں کہ یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ جس بھائی کو بڑے بھائیوں نے کبھی گود میں کھلایا ہوگا اور اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ پریشان ہو گئے ہوں گے، وہی بھائی جب برابر کا حصہ دار ہوا تو بڑے بھائی اس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ یہ صورت حال اکثر مجھے خون کے آنسو رُلاتی ہے۔''

یہ کہتے کہتے پتا نہیں کہاں سے پانچ چھے گرم گرم قطرے آنکھوں میں آ گئے، جنھوں نے میری آنکھیں جلا ہی دیں، میں نے انھیں ہینڈ کرچیف میں جذب کیا۔ اچانک نوین نے پھر پوچھ لیا۔

''—— اچھا تم کہہ رہے تھے کہ جب لڑکی جوان ہوتی ہے تو گھر کے مرد جمع ہو کر اس کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟''

''—— ڈوڈ! اس کا مطلب یہ ہے کہ میوات میں عورتوں کو فیصلوں اور مشوروں میں شریک نہیں کیا جاتا۔ ان سے کبھی گھر کے معاملات ڈسکس نہیں کیے جاتے۔ دراصل انھیں اس قابل سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اگر کوئی کہے بھی کہ ذرا ان سے بھی تو پوچھ لو تو مرد منہ بنا کر کہتے ہیں ''اس سے پوچھیں؟ تم بھی حد کرتے ہو——!'' یہ کہتے وقت ان کی چہروں کے نقوش تیکھے اور نفرت انگیز ہو جاتے ہیں اور ان سے حقارت ظاہر ہوتی ہے۔ کتنا عجیب ہے نا، جو عورت جیون ساتھی یا شریک حیات ہے، جو گھر کی آدھی مالک ہے، جس نے شوہر کو اپنا مجازی خدا مانا ہے، گھر کے معاملات و فیصلے طے کرتے وقت اسے ہی نااہل اور قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی رائے اس وقت نہیں مانی جاتی۔ عورتیں جب اس عدم توجہی پر اعتراض کرتی ہیں تو انھیں برا بھلا کہہ کر ڈانٹا جاتا ہے یا انھیں گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔

www.urduchannel.in



ہمارے گاؤں کی انوری کو اس کے شوہر اور بیٹوں نے اسی بات پر نکال دیا تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی طے کرتے وقت اس کی مرضی نہیں پوچھی گئی۔ اس نے اس پر اعتراض کیا تو پورے گھر میں کہرام سا مچ گیا۔ گھر کی شانتی کے لیے اسے نکلنا پڑا۔ چنانچہ پانچ چھے مہینے وہ اپنے میکے میں یا دوسرے رشتے داروں کے یہاں پڑی رہی۔ اس کی گھر واپسی اسی وقت ہوئی جب اس نے آئندہ کسی بھی معاملے میں کچھ نہ بولنے کی پکی قسم نہ کھالی!''

طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ جب مردوں کے ذریعے طے کیے معاملات اور لے گئے فیصلے ناکام ہو جاتے ہیں تو اس کی گاج بھی بے چاری عورتوں پر ہی گرتی ہے۔ اس کے لیے وہ عجیب عجیب دلیلیں لاتے ہیں اور عورت بے چاری اپنا ہی سر پھوڑ کر رہ جاتی ہے۔''

''—— وہاں عورتوں اور لڑکیوں سے پوچھا نہیں بلکہ ان کو اپنا حکم اور فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ جس کی پاسداری، جس پر عمل کرنا اور جسے ماننا ان کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے بھی کہ اس کا کنکشن ان کی عزت سے بھی جڑ جاتا ہے۔ اس طرح میوات کا معاشرہ، مکمل مرد اساس معاشرہ ہے۔ شہروں میں کیا مرد اساسی ہوگی، یہاں تو ذرا سی مردوں نے من مانی کی، عورتیں سڑکوں پر نکل آتی ہیں، مگر میوات میں عورت پوری زندگی مرد کے مکمل تسلط کے زیر اثر رہتی ہے اور اف تک نہیں کہتی۔ سینہ بہ سینہ اور روایت بہ روایت عورت کا یہ زیر پن اور مرد کا یہ اساس، دوسری نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مرد اس کے لیے قرآن سے دلیلیں لاتا ہے اور بے چاری عورت چپ ہو کر رہ جاتی ہے۔''

''—— اور میوات میں تعلیم و پڑھائی کی کیا صورت حال ہے؟'' نوین نے ایک اور سوال داغا۔ ہم لوگ باتیں کرتے کرتے جے این یو کے پرفضا اور اونچی اونچی پہاڑیوں والے مقام پی ایس آر، میں داخل ہو گئے تھے۔ آج یہاں کے اوپن ائیر تھیٹر میں ایک

پروگرام تھا— ''ماٹی کے رنگ''— جس میں ملک کے مختلف حصوں کے لوک گیت، ڈرامے اور ثقافتیں پیش کی جانی تھیں۔ بہت سے اسٹوڈنٹ [گرلز/بوائز] ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھنے جارہے تھے۔ مگر میں اور نوین یہاں کی سب سے اونچی چٹان پر بیٹھ کر قطب مینار اور آس پاس کے علاقوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو اتنی اونچائی سے صاف نظر آرہے تھے۔ ہمارے اوپر سے انٹرنیشنل ائیرویز کی فلائٹس آجارہی تھیں۔ ان کی آواز فضا میں گڑگڑاہٹ مچاجاتی، پھر کچھ سکون ہونا ہی پاتا کہ پھر سے کوئی فلائٹ چلی آتی اور پھر وہی عالم، پھر وہی کیف.....

''—— ہوں.....'' میں نے کہنا شروع کیا۔

''—— پرائمری اور پلس ٹو کی پڑھائی تو برداشت کی جاتی ہے، مگر اعلا اور کالج کی تعلیم وہاں کسی کو نہیں بھاتی، نہ بچے پڑھتے ہیں اور نہ ہی کوئی اس کی تحریک چھیڑتا ہے۔ چنانچہ گریجویٹس اور ماسٹرس دور دور تک نہیں ملیں گے۔ جو چند ایک ہیں وہ ان علاقوں سے باہر ہیں۔ میوات میں لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا، یا ان کی تعلیم کے لیے جدوجہد یا وکالت کرنا اسی طرح سماجی روایات اور دستور کے خلاف بولنا تو سخت ترین جرائم میں شمار ہوتا ہے، جس کی سزا، وہاں کی پنچایتیں ناقابل بیان طریقوں سے دیتی ہے۔''

''—— اچھا یہ بتاؤ، وہاں شادیاں کس عمر میں ہوتی ہیں؟'' نوین نے بڑے پتھر پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا اس مرتبہ آنکھوں کے حلقے بھی چوڑا دیے تھے۔

''—— میوات میں بھی ہندوستان کے دور افتادہ علاقوں، بہار، جھارکھنڈ اور آسام کی طرح کم عمری میں شادی کرادی جاتی ہے۔ کبھی کبھی بچپن میں ہی بچوں کی شادیاں طے ہوجاتی ہیں جو انھیں مرضی نامرضی کے بغیر پوری عمر نبھانی پڑتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا

www.urduchannel.in



کچھ بڑا ہوا، ماں باپ نے اس کی شادی کرادی، جیسا جہیز ویسا مہر، جسے بیٹی اور بیٹے والے قبول کر لیتے ہیں۔ پھر بیوی بھی ایسی آتی ہے کہ شعور، عقل، سمجھ داری کی دشمن، منہ زور، چھوٹے بڑوں کی قدر وعزت سے عاری، بیٹا، ماں باپ، سماج، پنچایت اور گاؤں کے دباؤ میں اسے برداشت کرتا ہے۔ اسے پولیس اور کورٹ کچہری کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ اسے ڈرایا جاتا ہے اور جیل کا خوف دلایا جاتا ہے۔ وہ بے چارا ان حالات اور مشکلوں میں گھر کر قبول کر لیتا ہے۔ وہ اس کو برداشت کرتا رہتا ہے مگر ایک مدت بعد جب اس کی قوت برداشت ختم ہوجاتی ہے تو وہ اپنی پر آجاتا ہے۔ کوئی اس سے ذرا بھی کچھ کہے، اس کے اندر چڑچڑاہٹ پیدا ہوجاتی ہے، وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بے زار ہوجاتا ہے۔ اس کی اس حالت کے منفی نتائج واثرات اس کے ملنے جلنے والوں اور اس کے ہم خیالوں کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ پھر وہی دوست یار اس سے دور ہونے لگ جاتے ہیں۔ شام کو وہ کسی ہاری ہوئی فوج کے سپاہی کی مانند گھر لوٹتا ہے اور پھر بیوی، بچوں، ماں باپ، بھائی بہن سے لڑنا شروع کر دیتا ہے یا ان سے ہمیشہ کے لیے دور ہوجاتا ہے۔ اسی دوران میں اسے کچھ لتیں اور بیماریاں بھی لگ جاتی ہیں، وہ ڈرنکنگ اور اسموکنگ بھی کرنے لگ جاتا ہے۔ الٹی صحبتیں اور الّم غلّم کھانے اس کی صحت مسلسل بگاڑتے رہتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑے دنوں میں ہی اچھا خاصا کڑیل جوان، دھان پان ہوکر رہ جاتا ہے۔ کتنے روگ اس کے جی کو لگ جاتے ہیں۔ پھر گھر والے کچھ دن اس کو برداشت کر کے الگ گھر میں رہنے کا فرمان سنا دیتے ہیں...!

''—— یاسین کے باپ نے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا، ایک دن جب وہ نشے میں دھت گھر آیا۔ یاسین کا باپ غنی، دروازے پر ہی لاٹھی لیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک

قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی تو وہ کھنکار کر بولا:

''—— کون اے [کون ہے]؟!''

''—— بابا میں ہوں، یاسین!''

''—— آاا[ارے/او] کہاں نو[کہاں تھا] اب تک!''

''—— اڈا پے او(اڈے پر تھا)!''

''—— اُنی کتان کے سنگ ای ہووئے گو آج بی، تینے سارا گام میں ہماری ناک کٹوا راکھی اے، ٹٹا پٹا بی بات بناویں۔ تواے بالکل بی سرم نہائے۔''[ان کتوں کے ساتھ ہی ہوگا آج بھی! تو نے پورے گاؤں میں ہماری ناک کٹوا رکھی ہے۔ ایسے ویسے بھی باتیں بناتے ہیں تجھے بھی شرم نہیں آتی!''] غنی نے بہت غصے میں آنکھیں لال پیلی کرتے ہوئے کہا۔

''—— لکل جا میرا گھر سواب تو لوہین کوئی جگہ نائے... [نکل جا میرے گھر سے اب تیرے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے]....!''

''—— ٹھیک اے میں دھیرئیں چلو جاؤں گو، پر اب رات میں تو رہن دے... [ٹھیک ہے صبح نکل جاؤں گا لیکن اب تو رہنے دیں...] یاسین نے باپ سے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ اس کے بیوی بچے بھی رو رہے تھے اور غنی سے یاسین کو معاف کر کے گھر میں رہنے کی اجازت دینے کے لیے کہہ رہے تھے مگر غنی نے کسی کی ایک نہ سنی اور یاسین کو سختی سے وہاں سے نکل جانے کا فرمان سنا دیا۔

''—— اچھو[اچھا] ٹھیک اے[ہے]...'' کہتا ہوا یاسین وہاں سے سنسان اڈے کی طرف چل دیا۔ راستے میں آوارہ کتوں نے اسے دوڑا لیا۔ بے چارے نے ایک لکڑی کے تھڑے کے نیچے چھپ کر جان بچائی۔ خوف کے مارے اس کا بدن کانپ رہا اور آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ رات کی تیز سردی الگ بدن کاٹ رہی تھی۔ یاسین پر گھر کی

www.urduchannel.in



رسوائی کتوں کے ڈر اور تیز سردی اس طرح حملہ آور ہوئیں جیسے کوئی فوج اپنے دشمنوں پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کی تو ڈر کے مارے گھگی نکل گئی۔ اس نے اپنا منہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔''

دن بھر کا بھوکا پیاسا اور گھر سے نکالا ہوا نسان، تھر تھر کانپ رہا تھا اور کائنات کے قافلے تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔

''—— یہ پورے علاقہ میوات کا جگہ جگہ کا فسانہ ہے نوین! اور اسی کا بیاں ہے۔ کہیں کہیں اس میں شدت پائی جاتی ہے تو کہیں کچھ نرمی۔ کہیں کہیں پورا نقشہ ہی الٹا ہے اور کہیں کہیں صورت حال اس سے بھی بدتر۔ اسی لیے تو میرا میوات ساری دنیا میں اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا ثانی پوری دنیا میں نہیں ہے۔''

''—— تمھیں کیا مجھے بھی حیرانی ہے کہ 21ویں صدی کے دوسرے دہے کے اختتام اور تیسرے دہے کی ابتدا تک بھی میوات اپنی ان ہی روایات، رواجوں اور اصولوں پر چل رہا ہے، اس کی حالت آج بھی جوں کی توں ہے، اسے اس پر بجا طور پر فخر بھی ہے کہ اس کا علاقہ ساری دنیا میں واحد علاقہ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ روایات کی پاسداری میں اس کا ثانی دنیا بھر میں کوئی اور خطہ نہیں ہے، اسے اپنی اس بربادی اور وقت و زمانے سے پیچھے رہ جانے کا کوئی افسوس بھی نہیں۔ میوات اور میواتیوں کی پوری زندگی کسی مرد داناں کی مانند ہے جن پر کلام نرم و نازک سب بے اثر ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ مولانا ظفر علی خاں کا یہ شعر نوشتۂ دیوار ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی!
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا!!

مگر اس کو وہ لوگ پڑھیں تو کوئی بات بنے، وہ اس آفاقی فکر کو سرے سے گمراہی قرار دیتے ہیں، جس کے بعد سمجھ و فہم کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

○○○

## (3)

### دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے——

''اچھا یہ سب چھوڑو، کچھ اپنے بچپن کی باتیں بتاؤ؟'' اچانک نوین نے عجیب سا سوال کر دیا۔ ہم ابھی تک اس چٹان پر بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ آس پاس سیلفیاں لے رہے تھے اور کچھ خوش گپیاں ہانک رہے تھے۔ اوپن ائیر تھیٹر میں ہونے والے پروگراموں کی آوازیں یہاں تک بھی آ رہی تھیں—— ہم نے وہاں سے واپسی کا ارادہ کیا۔ چلتے چلتے میں پھر شروع ہو گیا!

''—— کوٹھی [بڑا کنواں] والے گاؤں کے تالاب پر بڑے نیم کے درخت کی چھاؤں میں، میں اپنے دوستوں، سلیم، راہل، چرنی، راجیش کے ساتھ لنگڑ گاڑی کا کھیل، کھیل رہا تھا۔ اس کھیل میں زمین پر چوکور سائز کے سوا سوا فٹ کے دس خانے بنائے جاتے ہیں اور ان میں ایک پیر اٹھا کر اچھل اچھل کر پھلانگتے ہوئے کانٹ [پتھر یا پکی مٹی کا ایک گول یا چوکور ٹکڑا] کو نکالنا ہوتا ہے۔ دسویں دونوں جانب کے پانچویں خانوں میں ''دلّی'' ہوتی تھی۔ ساون کے موسم میں یہ کھیل میوات میں بہت مقبول ہوتا ہے اور اسے نوعمر لڑکے لڑکیاں شوق سے کھیلتے ہیں۔''

''—— چوں کہ ''ایک، دو، تین—— بوڑھا بابا کی مشین'' بولی میں پہلا نمبر میرا ہی آیا تو

www.urduchannel.in



شروعات میں نے ہی کی اور میں تمام گھروں کو جیتتا ہوا چلا گیا۔ جب میں نے 'دلّی' بسا لی تو کھیل ختم ہو گیا۔ یعنی اس بازی کو میں نے جیت لیا تو باقی دوست سب ہار گئے۔ اس جیت کی خوشی میں شرط کے مطابق میں نے انھیں جیب میں رکھیں، سنترے، آم کے جوس اور دودھ ملائی میں بنی چاکلیٹ مٹھائیاں کھلائیں۔''

''—— ہم لوگ تھکن سے چوراسی نیم کے پیڑے نیچے بیٹھ گئے اور خوش گپیاں شروع ہو گئیں۔ اچانک ''دلّی'' والے خانے میں کراس کر کے بسائے ہوئے گھر پر میری نظر پڑی جو مجھے نہ جانے کب سے گھور رہا تھا۔

''—— سلیم! دیکھو یہ گھر مجھے کیسے گھور رہا ہے۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہی نا کہ گھر تو بسا لیا اب آ جاؤ دلّی—— ہیں نا۔''

اور میری یہ بات سن کر سب دوست ہنس پڑے۔

''—— پاگل ہو گوا ای تو، ہین 'دلّی'' کہاں پڑی اے۔ باؤلو کہیں کو۔ کھیل اے ای دلّی سمجھ روا ے۔ اب دلّی تو، ہین سے گھنی دور اے، جنے کتلو، ھا ھا ھا ھا اور ہون کا بارا میں تو کیسی کیسی بات سنی جاویں ہیں۔ ہون گیل چلتان اے لوٹ لیوا ے ایں اور سانجھ ہوتے ای سب اپنا دروجان نے بند کر لیویں... یا کا مونہئے دیکھو، آیئو بڑو دلّی میں گھر بسانیا ہونہہ...''

[یہ تو پاگل ہو گیا ہے یہاں دلّی کہاں ہے۔ باؤلا کہیں کا، دلّی تو یہاں سے بہت دور ہے جانے کس طرف، ھا ھا ھا ھا اور وہاں کے بارے میں تو کیسی کیسی باتیں سنی جاتی ہیں۔ وہاں راہ چلتوں کو لوٹ لیا جاتا ہے اور سانجھ ہوتے ہی سب اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں.....اس کا منہ دیکھو پاگل کا، بنا ہے بڑا دلّی میں گھر بسانے والا...ہونہہ] سب نے ایک ساتھ منہ

چڑھایا۔ان کا یہ طنز اور ہنسی سن کر میں نے بھی آنکھیں کے دائرے وسیع کر لیے اور سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہنے لگا—:

''—— دیکھ لیجو، میں ایک دن ضرور دلّی جاؤں گو اور ہون سچی مچی کو گھر بسا کے دکھاؤں گے، تم دیکھ لیجو ....''

[دیکھنا ایک دن میں ضرور دلّی جاؤں گا اور وہاں سچ مچ کا گھر بسا کر دکھاؤں گا تم دیکھنا]

اس بار وہ اور زور زور سے ہنستے ہوئے اور تالیاں پیٹتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔مگر میرے دل میں یہ خیال وقت کے گزران کے ساتھ ساتھ حقیقت بنتا چلا گیا۔

''—— میں دلّی جاؤں گو....میں دلّی جاؤں گو...''بس یہی رٹ تھی جو بے اختیاری میں بھی میری زبان پر آجاتی۔''

○○○

ایک دن گھر میں کھانا کھاتے وقت میرے منہ سے یہی جملہ نکل گیا۔مائی [دادی] بابا [دادا] ماں، باپ، بڑے چھوٹے بھائی بہن، سب ایک ساتھ مجھے اس طرح گھورنے لگے جیسے میں نے....ان کی آنکھوں میں، میں نے عجیب سی کراہیت اور غصہ دیکھا۔چنانچہ اس موقع پر سہم جانے کی اداکاری کے سوا کوئی اور بات نہیں بنی۔جسے گھر کے بڑوں نے میری خطا پر شرمندگی سمجھ کر اپنے تیور درست کر لیے اور پھر کھانا شروع ہو گیا۔سہمی سہمی آنکھوں سے میں نے مائی کی جانب دیکھا، ان کی آنکھوں میں مجھے یک گونہ سکون ملا، جیسے وہ میرے ارادوں کی تائید کر رہی ہوں اور کہہ رہی ہوں''بیٹا! ٹیم آن دے، دلّی تو کہا، تُو کہیں بی چلو جائیو ...''[بیٹا وقت آنے دے، دلّی تو کیا کہیں بھی چلے جانا] مجھے ان آنکھوں سے بہت حوصلہ ملا۔

www.urduchannel.in



''—— ان ہی دنوں سلیم، چنی، راجیش اور دوسرے دوستوں کا نام اسکول میں لکھوا دیا گیا اور مجھے محلے کی مسجد کے امام کے حوالے کر دیا گیا۔''

''—— مکتب میں اور بھی بچے پڑھ رہے تھے اور الف، با، پا، کے شور کے ساتھ ساتھ کچھ بڑی عمر کے لڑکے لڑکیاں سپارے اور قرآن شریف بھی زور زور سے پڑھ رہے تھے۔میرا دل وہاں بالکل بھی نہیں لگا۔میں ایک ایک کا منہ تک رہا تھا اور ان کا جھوم جھوم کر پڑھنا بھی دیکھ رہا تھا۔بیچ میں گدی پر بیٹھے استاذ جی، مہندی کی قمچی لہرا لہرا کر ڈرا رہے تھے۔اچانک وہ اٹھے اور میری پیٹھ پر تین چار جما دیں۔ساتھ میں مغلظات، گھڑکیاں، نخوت، آنکھوں کے تیور، ان سب نے مجھے ڈرا دیا۔ڈر سے میرا سامنا پہلی بار ہوا تھا۔پھر جب تک چھٹی ہوئی، میں روتا رہا۔چھٹی ہوتے ہی وہاں سے ایسے بھاگا جیسے زبردستی سے بند کی گئی چڑیا پنجرہ کھولتے ہی پھُر ہو جاتی ہے۔میں سیدھا گھر آیا اور ایک کونے میں چھپ کر بہت دیر تک رویا، پھر جانے کب نیند آ گئی۔''

''—— شام کو میں نے گھر والوں سے کہا کہ میرا نام بھی اسکول میں لکھوا دو، میں مکتب میں نہیں پڑھنا چاہتا، جس کے جواب میں مجھے مارا پیٹا گیا اور مجھے سختی سے اسکولی تعلیم سے دور رکھا گیا۔خدا جانے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا، وہ کیا سمجھتے تھے کہ میں نے ان سے اتنا بڑا کیا مانگ لیا ہے۔بہر حال اس دن کے بعد سے میں نے مکتب جانے میں ہی عافیت سمجھی اور کبھی اسکول جانے کا نام نہیں لیا۔''

''—— ہمارے مکتب کے استاذ جی پہلے پہل برے لگے مگر پھر وہ مہربانی اور نرمی سے پیش آنے لگے۔قاعدے میں انگلی رکھ کر ایک ایک حرف بتاتے اور اپنی سمجھ بوجھ کے اعتبار سے اس کی ادائیگی کراتے، بہت بعد میں پتا چلا ان کے ذریعے ادا کرائے گئے تلفظ اور حروف کی ادائیگی سب غلط تھے، چنانچہ پھر ان کو درست کیا گیا دوبارہ سب الفاظ

درست طریقے سے زبان پر چڑھائے۔ ان ہی دنوں یہ حقیقت بھی واشگاف ہوئی کہ ابتدائی تعلیم اور ایسے ماحول میں جہاں اس کا باقاعدہ اور ٹھوس نظام نہ ہو، واقعی ابتدائی ہی ہوتی ہے جس پر آگے کی تعلیم کی بنیادیں قائم نہیں کی جاسکتیں، تاوقتیکہ ابتدائی تعلیم ہی سہی، مناسب و مضبوط انتظام کے تحت نہ ہو۔ لہٰذا ابتدائی تعلیم ہی ٹھوس اور مضبوط طریقے سے ہونی چاہیے تاکہ اس کے آگے کی منزلیں بہت آسانی سے طے ہوسکیں۔ اسی لیے مناسب بیسک ایجوکیشن میں مادری زبان میں کی اہمیت ہے۔''

○○○

جے این یو کی شام اب رات میں تبدیل ہوچکی تھی اور اب ہم پھر اراولی نیشنل گیسٹ ہاؤس کے لان میں تھے اور رنگ روڈ کی سفید لائٹوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ایسی لگ رہی تھیں، جیسے آسمان پر گول ہالہ بنا کر اس کی گولائی میں چاند تارے جڑ دیے گئے ہوں۔ نوین پر اکتاہٹ چھاتی جارہی تھی مگر وہ رات میں نے نوین پر حرام کردینے کا ارادہ کرلیا تھا۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی، وہ تو میری زندگی کے مندمل ہوتے زخم کریدے اور میں اسے سونے دوں، لہٰذا میں نے بات سے بات نکالتے ہوئے ایک دلچسپ داستان چھیڑ دی——

''—— سنو نوین، سنو!''

''—— یہ میرے بچپن کی بات ہے۔ میں اس وقت سیاست اور راج نیتی کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہاں کانگریس، بی جے پی، سماج وادی، بی ایس پی جیسی پارٹیوں کے نام اکثر سنا کرتا۔ ان ہی دنوں راجستھان کی بی جے پی حکومت آں جہانی بھیروں سنگھ شیخاوت کی قیادت میں اپنے پانچ سال پورے کررہی تھی، الیکشن کا بگل بجا اور برساتی مینڈکوں کی طرح گم نام و نام چین امیدوار، میدان میں آگئے۔ اس کے لیے دیگر گاؤں کے طرز پر ہمارے قصبے کے چوک چوراہوں میں بھی پارٹیوں کی جھنڈیاں، نیتاؤں کی قدآدم تصویریں

www.urduchannel.in



لگائی گئیں۔ جن میں سونیا گاندھی کی بے نظیر اسٹائل میں ہاتھ اٹھائے قدآدم تصویر اور صوبائی تنظیم کے چند بڑے لوگوں کی رنگ برنگی پگڑیاں باندھے تصویروں کے سائن بورڈ بہت بھاتے تھے۔ دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی کی جھنڈیاں اور بینرز تھے۔ جن کا بھگوا اور ہرا رنگ دیکھنے سے ہی وحشت ہوتی تھی۔ پورے دن قصبے کے بس اڈے کی فرنٹ لوکیشن پر موجود، دکانوں کی چھتوں پر مائک سے فل والیوم میں دیش بھکتی کے گانے بجتے اور درمیان میں متعلقہ پارٹی اور امیدوار کی حمایت میں روایتی جملے دہرائے جاتے:

''—— بھائی کرم سنگھ، سب کے بھائی، اچھے بھائی۔ سب کو دیکھا بار بار کرم سنگھ بھائی اب کی بار۔ ہمارا نیتا کیسا ہو، بھائی کرم سنگھ جیسا ہو۔'' ریکارڈ کٹ 2—— اور درمیان میں محمد رفیع کا مشہور گانا شروع ہوجاتا ''—— میرے دیس کی مٹی سونا اگلے...'' پھر دوسرا ریکارڈ بجتا:

''بھائی کرم سنگھ، کرمٹھ، ایمان دار نیتا، ہم سب کے نیتا——'' ''کوئی نہیں ہے ٹکر میں، کیوں پڑتے ہو چکر میں'' اور پھر اس کے بعد جیتنے کی صورت میں وعدوں کی بھرمار——''

''—— گلی گلی میں کاروں، سائیکل رکشوں، ٹریکٹرس میں لگے وہ ریکارڈ کان پھوڑتے چلے جاتے۔ جدھر سے بھی یہ ریکارڈ گزرتے، گھروں میں موجود خواتین اور بچے منڈیروں پر آجاتے اور انھیں دور تک جاتا دیکھتے رہتے۔ گلیوں اور راستوں میں موجود بچے، نوجوان، بوڑھے امیدوار کے ''چناؤ چنہ'' [نشان انتخاب] اور وعدوں سے بھرے لال پیلے، نیلے، ہرے پرچوں کو شوق سے اٹھاتے اور باآواز بلند پڑھتے چلے جاتے۔ کچھ ڈائی ہارٹ یا ٹمپریری سپوٹروں نے تو اپنے گھروں کی چھتوں پر ان پارٹیوں کے پرچم بھی لگا لیے تھے اور چھوٹی چھوٹی جھنڈیوں کی جھالریں بھی۔ جھنڈے، جھنڈیاں ہوا میں پھیراتے ہوئے عجیب سے منظر پیش کرتی تھیں اور بجتے ریکارڈ دور سے ہی جوش سا بھر دیتے تھے۔''

’’’—لوگ بتاتے تھے یہ سائیکل والے آئے ہیں، یہ پھول والے ہیں، یہ پنجہ والے ہیں اور یہ ہاتھی والے، میں بس اتنا ہی جانتا تھا۔ یہ لوگ اعلان کرتے ہوئے اور شور مچاتے ہوئے آتے ، کچھ دیر کے ہنگاموں کے بعد مٹی بھرے راستے پر بچوں کے ہاتھوں میں ان پارٹیوں کی جھنڈیاں اور پرچے رہ جاتے۔ یہ گاڑیاں جانے کہاں سے آتیں اور جانے کہاں چلی جاتیں۔لیکن ماحول میں عجیب سا اثر چھوڑ جاتیں۔‘‘

یادوں کی پرچھائیاں ذہن میں رقص کررہی تھیں اور نوین ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دیے شوق سے سن رہا تھا۔

’’—ان دنوں ایک نغمہ بہت مقبول ہورہا تھا:

○○○

’’—انتخابی مہمات کو انجام دینے اور کامیاب بنانے کے لیے پارٹیوں کے بڑے لیڈران بھی گاؤں اور قصبوں کے دوروں کررہے تھے۔‘‘ میں کچھ دیر سانس درست کر کے پھر کہنا شروع کیا۔

ہمارے قصبے میں بھی اس وقت کے مرکزی وزیر دفاع اور سماج وادی پارٹی کے سابق صدر ملائم سنگھ یادو آئے۔ان کے آنے کی خبر جیسے ہی عام میں ہوئی، ہمارے قصبے میں آس پاس کے پچاس ساٹھ گاؤں کے لوگ،عورتیں، بچے، بوڑھے لاکھوں کی تعداد میں آ گئے۔ ان دنوں ہمارا قصبہ شہر بن گیا تھا۔ راستوں پر ٹینٹوں میں ہر طرح کی دکانیں سج گئیں، کناتوں میں ٹھیلے اور میلے لگ گئے۔خفیہ پولیس اور سول پولیس کی بے آواز و آواز دار کاروں کے دورے ہونے لگے۔کبھی کبھی رات میں بھیانک سائرن بج اٹھتے۔قصبے کے کوٹھی[بڑا کنواں] میدان میں پتھروں، مٹی، بجری، گارے اور دیگر میٹریل سے ہیلی پیڈ

www.urduchannel.in



بنانے کے لیے عجیب وغریب کرینیں، بلڈوزرس اور مشینیں آئی تھیں۔ وہیں قریب میں بھاشن پنڈال بھی بنایا جارہا تھا۔بیس دن کی اس تیاری کے بعد، تین گھنٹے کی تاخیر سے ملائم سنگھ یادو کا ہیلی کاپٹر ہمارے قصبے کی فضاؤں میں نمودار ہوا، جسے دیکھتے ہی، وہاں موجود لوگ پرجوش انداز میں چیخ اٹھے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر اس میں آنے والوں کا استقبال کرنے لگے۔ ہیلی کاپٹر دھیرے دھیرے اپنی جگہ اتر گیا۔اس کا پنکھا قریب پانچ منٹ تک چلتا رہا۔ جب وہ بند ہوا تو ملائم سنگھ یادو اپنے دو تین ساتھیوں سمیت ایک ہاتھ سے اپنی سفید دھاری دار دھوتی سنبھالے اور ایک ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے اترے ۔ سماج وادی پارٹی ،راجستھان اکائی کے ورکروں ، پارٹی عہدے داراوں ، ریاستی سرکار کے نمایندوں، ایجنسیوں، پولیس اور دیگر انتظامی محکموں کے افسران نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ وہ اسی استقبالی جلوس کے ساتھ اسٹیج پر پہنچے۔انھوں نے وہاں کیا کیا کہا اور کیسے کیسے؟ وہ تو نہیں معلوم، مگر ان کی شاندار شخصیت نے بہت سے لوگوں کو متاثر ضرور کیا۔ان کی وہ شبیہ تو اب تک لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں موجود تھی جو بابری مسجد کی شہادت کے وقت ان کی جرأت مندی سے بنی تھی اور جس نے انھیں ’’ملا ملائم سنگھ‘‘ بنا دیا۔ملا ملائم سنگھ نے اس وقت یوپی کی بی جے پی حکومت کو آڑے ہاتھوں لے کر سخت انداز میں للکارا تھا۔‘‘

’’—ایک چھوٹے سے قصبے میں ہیلی کاپٹر آنا، ایک یادگار عجوبے سے کم نہیں تھا۔ایک ایسے قصبے/علاقے میں ہیلی کاپٹر آنا جو شہروں اور بڑی جگہوں سے کٹا ہوا ہو، ایک یاد رکھنے والی بات تھی، چنانچہ وہاں موجود لوگوں نے اس موقع کا خوب فائدہ اٹھایا-وہ ہیلی کاپٹر کو بہت قریب سے دیکھ رہے تھے۔سینکڑوں تو اسے ہاتھ سے چھو کر بھی دیکھنا چاہتے تھے۔مگر انھیں سیکوریٹی اہلکاروں نے روک رکھا تھا۔تاہم ایک بڑھیا پھر بھی ان سے لڑتے بھڑتے،

منتیں کرتے آخر ہیلی پیڈ تک پہنچ ہی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے اسے مٹھائیوں کا ایک ڈبہ دیا تھا، جسے اس نے دعائیں دیتے ہوئے قبول کرلیا تھا۔''

''—— دو۔ڈھائی گھنٹوں بعد وہ ہیلی کاپٹر ان ہی فضاؤں میں گم ہوگیا جن میں سے وہ نمودار ہوا تھا۔اس کے بعد لوگوں کے قافلے اور بھیڑ بھاڑ بھی ادھر ادھر بکھر گئی۔ جانے کہاں سے آئے تھے وہ لوگ اور کہاں جا کر سما گئے؟''

''—— راجستھان میں ہونے والے اس الیکشن کے نتائج کانگریس کے حق میں آئے اور اشوک گہلوت گیارھویں وزیر اعلا بنے۔الیکشن کے ہنگامے فرو ہوئے، چوراہوں اور دکانوں و مکانوں کی چھتوں سے مائک و جھنڈے اتر گئے اور گلیوں میں پھیراتی ہوئی جھنڈیاں کٹی پھٹی حالت میں جھولتی رہ گئیں۔جن سے عجیب سی وحشت ہویدا ہوتی تھی، ایسا لگتا تھا کہ غنیم کا لشکر یہاں آیا تھا اور سب کچھ تباہ و برباد کر کے چلا گیا۔''

○○○

''—— اب اور سن!''

''—— ہمارے مکتب کے امتحانات سر پر تھے۔اس لیے ہم سب بچے بہت محنت کرتے تھے۔رات میں بھی پڑھائی کرتے اور موم بتیاں جلا کر سبق یاد کرتے تھے۔گھر واپس آتے آتے بہت اندھیرا ہو جاتا تھا۔لائٹ بجلی کا دور دور تک نشان نہیں۔مکتب سے باہر آتے ہی کھیتوں سے آوارہ کتوں اور گیدڑوں کی آوازیں آتیں جن سے میں بری طرح سہم جاتا تھا۔ہمارے گھر کے سامنے سے ایک کچا راستہ گزرتا تھا اور اس کے دونوں جانب بڑے بڑے کیکر کے درخت تھے جو رات میں انتہائی ڈراؤنا منظر پیش کرتے تھے۔ان میں جھولتے ہوئے پھٹے پرانے سفید کپڑے تو ایسے لگتے جیسے وہ بھوت پریت کے لمبے لمبے دانت ہوں یا

www.urduchannel.in



ان کی داڑھی ہل رہی ہو۔''

''—— ایک دفعہ رات میں، اکیلا مسجد سے آتے ہوئے میں ان سے بری طرح ڈر گیا۔ایک عجیب سی دہشت میرے سینے میں داخل ہوگئی۔ مجھے عجیب عجیب سی ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں۔اس کا اثر مجھ پر ایسا ہوا کہ مجھے بہت تیز بخار ہوگیا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرا سر پھٹ ہی جائے گا اور میرے ہاتھ پیر ٹوٹ کر گر جائیں گے۔میں بری طرح ہاتھ پیر پٹخ رہا تھا۔ان دنوں مجھے انجکشن سے بہت ڈر لگتا تھا۔مگر اس کے باوجود مجھے دس انجکشن لگائے گئے۔میرا بدن پوری طرح ٹوٹ چکا تھا۔اسی عالم میں، میں نے مکتب کا سالانہ امتحان دیا۔''

''—— مکتب کی پڑھائی کے بعد میں اسکول میں پڑھنا چاہتا تھا مگر مجھے اپنی اس خواہش کا اظہار بہت مہنگا پڑا۔ مجھے اس دن بہت پیٹا گیا اور اسکول کے نام پر برا بھلا کہا گیا پھر ایک ایسے مدرسے میں داخل کرا دیا گیا جو شہر اور شہری تمدن سے دور، بے آب و گیاہ جنگلوں میں واقع تھا۔ جہاں پینے والا پانی بھی 30 - 35 کلومیٹر دور سے ٹینکروں کے ذریعے آتا تھا۔مدرسے کے چاروں طرف حدنگاہ تک ریتیلے کھیت اور دھوپ سے جلے درخت تھے—— چالیس پچاس فرلانگ پر ایک سوکھی نہر تھی، پتا نہیں آخری وقت اس میں پانی کب آیا تھا۔ ان وحشت ناک جنگلوں میں سات سال میں نے گزارے اور کیسے گزارے یہ میں ہی جانتا ہوں—— یہاں سب کچھ سختی کے کولہو میں پیسا جاتا تھا۔معصوم بچوں سے ذرا سی خطا ہو جاتی، ان غریبوں کی جان پر بن آتی۔کوئی غلطی ہو جانے پر پیار اور شفقت سے سمجھانے کے بجائے، انھیں سزا کے طور پر چوروں کی مار ماری جاتی۔نوخیز اور نو عمر طلبا کو ''تربیت'' کے نام پر داڑھیاں اور بال پکڑ کر رسوا کیا جاتا تھا۔سمجھ میں نہیں آتا تھا

کہ نونہالوں اور قوم کے اماموں کی تربیت کا یہ کیسا طریقہ تھا؟ ان معصوموں کو یہ کیسے ٹرینڈ کیا جارہا تھا؟ یہ سوالات آج بھی مجھے دیر تک افسردہ رکھتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ میرے جگر کا روگ بن جائیں، یہی میرے خوں فشاری کا باعث بھی بنیں——!"

نوین میری باتوں کو ایسے سن رہا تھا، جیسے میں اسے قلوپطرہ کی کہانیاں سنا رہا ہوں، وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی پہلو بدل رہا تھا— اور میں کہتا جا رہا تھا:

''—نوین! وہ سلوک تو کسی طور بھلانے کے قابل نہیں ہے جو محمد انصار کے ساتھ کیا گیا تھا جب وہ کسی مجبوری کے سبب غیر حاضر ہو گیا تھا اور رجسٹر میں اس کی غیر حاضری لگ گئی تھی۔ سب سے پہلے تو اس کا کھانا اور کمرے کی رہائش ختم کر دی گئی، پھر اس کا سامان اور کتابیں بھی کمرے سے باہر پھینک دی گئیں۔ اس دن بارش ہوئی تو اس غریب کا یہ سامان اور کتابیں بھیگ گئیں اور کیچڑ میں الگ سے لت پت۔ جب محمد انصار پانچ دن بعد مدرسہ آیا تو اپنے سامان کی یہ حالت دیکھ کر رو پڑا۔ وہ اسے اٹھا کر کمرے میں رکھنے لگا تو کمرے کے ساتھیوں نے ہی منع کر دیا اور کہا کہ جاؤ پہلے مولانا عابد حسین صاحب سے پرچی/فائن بنوا کے لاؤ۔ مولانا عابد حسین مدرسے میں خوف و دہشت اور درندگی کا دوسرا نام تھا۔ وہ طلبا کے غیر حاضر ہونے پر ان کی داخلہ پرچی بناتا، اسی طرح چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر سخت سزا دینا بھی ان کا ہی کام تھا۔ وہ سب بچوں کے سامنے 'خطا کاروں' کو لات گھونسوں، گالیوں، کوڑوں اور کھجور کی قمچیوں سے مارتے مارتے ان کو لہولہان کر دیتا تھا۔ پورے جسم پر نیل پڑ جاتے تھے اور وہ کئی دن تک دکھتا رہتا تھا۔ مار کھانے والا نہ اٹھ بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی سو سکتا تھا۔ محمد انصار نے جب اس کا نام سنا تو وہ مارے خوف کے پھر رونے لگا اور کمرے کے ساتھیوں سے ہاتھ جوڑ کے درخواست کرنے لگا کہ مولانا کو مت بتانا اور مجھے روم میں رکھ

www.urduchannel.in



لو، مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مگر چند چمچہ ٹائپ لڑکوں نے اس کی شکایت مولانا سے کر دی۔ انھوں نے نمک مرچ لگاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ مولانا صاحب! وہ آپ کو برا بھلا بھی کہہ رہا تھا اور آپ کے پاس آنے سے بھی اس نے منع کر دیا۔''

''—اس کی یہ ہمت!''

''—یہ باتیں سن کر مولانا کا پارہ ہائی ہو گیا اور اس نے چمڑے کا کوڑا اٹھایا اور ہاسٹل آ کر سب کے سامنے محمد انصار کو عبرت ناک سزا دے کر اس کی پرچی بنائی۔ آج تک میری آنکھوں میں وہ منظر محفوظ ہے۔ اکثر میں اسے یاد کر کے اندر ہی اندر لرز جاتا ہوں اور خوف کے گھنے سائے میرے اردگرد منڈلانے لگتے ہیں۔''

''—مدرسے میں صبح کے چار بجے سے ہی پڑھائی شروع ہو جاتی جو آٹھ بجے تک چلتی رہتی۔''

میں نے اپنے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے نوین کو بتایا جو بت بنا، مجھے ہی دیکھے جا رہا تھا۔

''—نو بجے ناشتہ ملتا۔ ناشتے کے نام پر صرف چائے۔ چائے بھی ایسی جس میں پانی ہی پانی، دودھ کا پتا نہیں اور نہ ہی پتی کا۔ عجیب سی ہوتی تھی، ایک ایک، آدھے آدھے گلاس ملتی اس کے بعد ناشتے کا ٹائم ختم اور پھر پڑھائی شروع۔ ایک بجے چھٹی، کھانا، ڈیڑھ گھنٹہ آرام، پھر پڑھائی۔ شام آتی وہ پڑھائی کی نذر اور رات دس بجے تک بھی پڑھائی— پورے دن پڑھتے پڑھتے عجیب سی حالت ہو جاتی تھی۔ صحتیں برباد، پیٹ کا ہاضمہ خراب، سروں میں الگ درد، ایک نام نہاد دوخانے سے ہر مرض کے لیے ایک ہی دوا ملتی تھی۔ اس پر اسی حالت میں پڑھتے رہنا۔ کتنے ایسے بچے تھے جنھیں عدم تغذیہ یعنی کپوشن کی بیماریاں لاحق

ہوگئیں۔''

''—— مدرسے میں ہم بچوں کو دنیاداری، سیاست، سماج، کھیل کود، تفریحات غیرہ سے بالکل دور رکھا جاتا۔ طلبا کی بات تو رہنے دو، اساتذہ کو بھی ان سے دور رکھا جاتا تھا بلکہ انھیں سختی سے ووٹ دینے سے بھی منع کیا جاتا۔ سخت بوریت تھی وہاں اور روح شکن سختیاں، کیسے وہاں ہماری معصوم تمناؤں کو کچلا جاتا تھا۔ اس موقع پر کچھ قصے تو میں تمھیں ضرور سناؤں گا۔''

میں نے نوین کے چہرے کے آگے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہنا شروع کیا——!

''—— مجھے ان ہی دنوں کا ایک واقعہ یاد ہے۔ کچھ بچے رات کے وقت مدرسے سے باہر نکل گئے اور پانچ چھے کلومیٹر دور ایک گاؤں میں سی ڈی پلیئر پر فلم دیکھنے لگے [الزام یہی تھا] اس کے بعد وہ رات میں ہی واپس آ گئے مگر مدرسے کے پہرے داروں اور ایک دو استادوں نے انھیں دیکھ لیا، بدقسمتی سے وہ پہچان لیے بھی گئے۔ اسی وقت ان کو پکڑ کر ایک خفیہ کمرے میں بند کر دیا گیا۔ پورا دن انھیں بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ شام کے وقت سب بچوں کے سامنے وہ سزا دی کہ میں آج بھی یاد کر کے کانپ جاتا ہوں۔ اس دن مجھے نہ نیند آتی ہے اور نہ کھانا پینا اچھا لگتا ہے۔''

نوین سنو! تمھیں ایک اور واقعہ سنانے لگا ہوں——!!

''—— اسی درمیان اسٹیٹ اسمبلی کی دو تین سیٹوں پر بائی پول کا اعلان ہوا، ان ہی دنوں مدرسے کے ذمے داروں بالخصوص ناظم تعلیمات (رجسٹرار) مولانا انور قاسمی نے گھنٹی بجا کر سب بچوں اور اساتذہ کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ جب تک یہ گاڑیاں اعلان کرتی پھر رہی ہیں اور جب تک یہ الیکشن چل رہے ہیں، تم میں سے کوئی باہر نہیں جائے گا۔ ان سے



دور رہنا ہے اور اپنا ایمان عقیدہ ان فریبی نعروں اور گانوں سے بچانا ہے۔ یہ سب طریقے حرام ہیں اور ہمارے ایمان کے لیے سخت خطرہ ہیں—— اور ہاں! تم پر ووٹ دینا بھی واجب نہیں ہے [یہ بات انھوں نے اساتذہ کو اشارہ کرتے ہوئے کہی] اس لیے کہ ہم لوگ اللہ کے کلمے اور رسول کی باتوں کو سیکھنے کے لیے مدرسے میں آئے ہیں، ہم مسلسل سفر میں ہیں، منزل کی جستجو میں ہیں۔ ہمارا کوئی گھر نہیں ہے، ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ ہمیں ویسے بھی کافروں کو ووٹ دینا جائز نہیں ہے۔ ان لوگوں کی سرکار حرام اور ناجائز ہے، ہم جو خدا کے بہت زیادہ قریب ہیں، ہمیں ان ناجائز اور حرام اور سود خوروں کی سرکار قبول نہیں ہے نہ ہم اس کی تشکیل میں ان کے معاون بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے—— انھوں نے فوراً قرآن کی ایک آیت پڑھی:

''.....اور مدد کرو نیکی اور بھلائی کے کاموں میں اور برائی و شیطانی کے کاموں میں ہرگز تعاون مت کرو! [المائدہ:2]

''—— ان لوگوں کی سرکار بنوانا، برائی اور شیطانی کے کاموں میں ان کی مدد اور تعاون کرنا ہے جس کی اجازت میں ہرگز کسی کو نہیں دے سکتا۔''

''—— وہ بولتے جا رہے تھے اور ہم سب طلبا کان دبائے ان کو سنتے جا رہے تھے۔

''—— جن لوگوں کو پانی پینے تک کا طریقہ نہیں معلوم، جو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہیں، جو سود و حرام کھاتے ہیں، جن کے برتنوں میں بھی ہمارے لیے کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح جن کی صورتوں پر دنیا میں ہی لعنت اور پھٹکار پڑی ہے، کیا ہم ان کو ووٹ دے کر انھیں اپنا حاکم بنائیں گے؟ پتا نہیں یہ سوال تھا کہ دھمکی! مگر ہم طلبا اسے کچھ نہ سمجھ کر سہمے ہوئے تھے۔ انھوں نے چند باتیں اور کہیں اس کے بعد یہ میٹنگ ختم۔ سب بچے اور اساتذہ

www.urduchannel.in

اِدھر اُدھر ہو گئے۔''

''—— اس دن شام میں، میں نے اپنے ایک سیکولر مزاج استاذ، مفتی سلیم مفتاحی کو یہ سب باتیں بتائیں اور ان سے ان کی رائے جاننی چاہی تو انھوں نے جو مجھے بتایا، اس سے میرا ذہن جھنجھنا کر رہ گیا۔ انھوں نے کہا تھا:

''—— انیس! ووٹ دینا ہمارا جمہوری اور وطنی حق اور فریضہ ہے۔ ہمارا مذہب اس سے کہیں نہیں روکتا، ہندوستان میں رہنے والے ہر شہری کا یہ حق ہے بلکہ ایک اچھی حکومت بنانے/بنوانے کے لیے فرض بھی ہے...''

مفتی سلیم کہتے کہتے رکے اور پھر کہنے لگے:

''—— تمھارے ذہن میں یقیناً سوال اٹھا ہوگا کہ، پھر انور قاسمی کیوں منع کر رہے تھے؟ تو سنو! قاسمی جاہل اور تنگ نظر شخص ہے، وہ دارالعلوم دیوبند جیسے سیکولر اور عظیم الشان انسٹی ٹیوٹ سے سند یافتہ تو ہو گیا مگر اس میں عقل وسوجھ بوجھ ابھی نہیں آئی یا اس نے اس کو دور سے ہی بھگا دیا، مگر اسے ہوش نہیں کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ اس عظیم الشان درس گاہ کو بھی بدنام اور رسوا کر رہا ہے جس کی بنیادوں میں ہی حریت، آزادئ وطن، انگریزوں کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کرنے والوں کا لہو اور ہڈیاں شامل ہیں۔ وہ لوگ تو ایسے نہ تھے، وطن پر قربان ہونے والے تھے مگر انور جانے کیوں ایسا کر رہا ہے۔ انیس! تم دیکھنا، ایک دن اس کی یہ تنگ نظری اور کم عقلی اسے برباد کر دے گی۔ سب سے پہلے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم بھی ہندوستانی ہیں اور ہندوستان میں ہمارے لیے بے شمار سہولیات دستیاب ہیں، حکومت ہند ہمیں ہر قسم کی آزادی دیتی ہے، یہ جمہوریت اور ووٹ دینے کا ہی فائدہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہم ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں رہ کر ووٹ دینے کے خلاف نہ تو باتیں کر سکتے ہیں

www.urduchannel.in



اور نہ ہی سوچ سکتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرنا ہمارے لیے خطرناک بھی ہو سکتا ہے اور اسے دوسرے برادران وطن بغاوت اور دیش سے غداری بھی سمجھیں گے، جب کہ ہمارا ایمان اور ہمارا مذہب تو وطن دوستی کی تعلیم سب سے زیادہ دیتا ہے، وطن کی جمہوری اور سرکاری تقریبات میں حصہ داری ہمارا عین ایمان ہے بلکہ تقاضا بھی——!''

مفتی سلیم مفتاحی اور بھی جانے کیا کیا، مسلمان، ووٹ، سیاست، سماج، ملک—— کہہ رہے تھے، مگر میں ان دو باتوں میں الجھ کر ہچکولے کھا رہا تھا جو آج صبح سے شام تک میں نے سنی تھیں۔ ایک طرف مولانا انور قاسمی کی باتیں تھیں اور دوسری طرف مفتی سلیم مفتاحی کے کلمات، میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔''

''—— پھر الیکشن کے ہنگامے ختم ہوئے، ووٹنگ کا دن آیا۔ پورے مدرسے میں مفتی سلیم مفتاحی اکیلے ایسے فرد تھے جو ووٹ ڈالنے گئے تھے اور ان کی انگلی پر جگمگاتے نیلے رنگ کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا تھا۔ مدرسے میں اسے بغاوت اور اصول شکنی کے طور پر دیکھا گیا۔ ان کی شکایت منتظم اعلا سے کر دی گئی۔ جس پر ان کے تیور سخت ہو گئے تھے اور چہرے پر نیلے پیلے کئی رنگ آ کر گزر گئے تھے۔

''—— یہ الیکشن مدرسے کے ماحول کو جنگ میں تبدیل کر گیا، کیوں کہ مفتی سلیم مفتاحی کی باتیں اور خیالات اب پورے مدرسے میں پھیل چکے تھے جنھوں نے مولوی قاسمی اور ان کے ہم نواؤں میں عجیب سی بے چینی پیدا کر دی تھی۔ مدرسے میں اندر ہی اندر کوئی لاوا سا پکنے لگا جو پھٹنے کو بے تاب تھا، اس سے پورا ماحول گرم ہو رہا تھا۔ ماحول کی گرمی اور ناعاقبت اندیشوں کے ہاتھوں کسی انہونی کے اندیشے کا احساس کر کے ایک رات مفتی سلیم مفتاحی بغیر کسی کو بتائے اپنے گھر واپس لوٹ گئے۔ ان کے پاس سامان کے طور پر تھا ہی کیا، ایک

چھوٹا سا بیگ تھا جس میں کچھ کپڑے اور فکر و آگہی بخشنے والی کتابیں ہوا کرتی تھیں، میں اکثر دیر تک ان کے خوشنما اور فکر انگیز ٹائٹلس دیکھتا رہتا، ایک ہی جست میں وہ میرے ذہن کو کہاں سے کہاں لے جاتے، بہت چھوٹی عمر میں ہی مجھے کچھ بڑی باتوں کا ''گیان'' حاصل ہو گیا تھا۔''

''—— مفتی سلیم کے جانے کے بعد مدرسے میں ایک عجیب سے اطمینان کا ماحول برپا ہو گیا۔ ایسا جیسے سمندر میں ہلاکت خیز طوفان آتے آتے خود ہی دب گیا ہو اور کشتی سبک لہروں پر چل پڑی ہو۔ مولانا انور قاسمی اور ان کے ہم نواؤں نے اس دن اپنی جیت کا جشن منایا اور اپنے حلقے میں مٹھائیاں تقسیم کیں۔ شام کے وقت گھنٹی بجا کر بچوں کو جمع کیا گیا اور انھیں بھی یہ خوش خبری سنائی گئی۔

''—— مولانا انور قاسمی بہت پر جوش انداز میں بول رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے آج وہ سینے میں چھپے سارے شعلے اگل دیں گے۔ وہ کہہ رہے تھے:

''—— مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اب تک مدرسہ دشمنان اسلام کے ایک ایجنٹ کو پناہ دیتا رہا، اسے کھلاتا پلاتا رہا۔ ہم سے کیسی غلطی ہو گئی کہ ایک بدعقیدہ شخص کو مدرسے میں استاذ رکھا، پتا نہیں اس نے کتنے بچوں اور استاذوں کا ایمان خراب کیا ہوگا۔ اس نے چند نمازوں کی امامت بھی کی تھی تو ہماری نمازیں بھی خراب ہو گئیں۔ اب وہ سب نمازیں ہمیں لوٹانی پڑیں گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے سازشی لوگوں نے ہمیشہ اسلام اور ہماری روایات کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ لوگ پرانے زمانوں میں بھی ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے کبھی منافق، کبھی سبائی اور کبھی منکر حدیث بن کر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے بانیٔ اسلام کو بھی نہیں بخشا۔ وہ تو معصوم تھے، وہ

www.urduchannel.in



تو دشمنوں سے اچھا سلوک کرتے تھے، ان کی ذات تو رحمۃ اللعالمیں تھی۔ مگر ان دشمنوں کو ان پر بھی ترس نہ آیا۔ یہ لوگ اتنے پر فریب انداز میں آتے ہیں کہ ہم انھیں پہچان ہی نہیں پاتے اور ان سے بار بار دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ایجنٹ اپنا کام/مقصد پورا کر کے چلے جاتے ہیں۔ مگر بچو! اب وہ ایجنٹ چلا گیا اور اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم آئندہ خیال رکھیں گے کہ ایسا کوئی اسلام دشمن اب ہمارے ایمان برباد نہ کرنے پائے۔ ہماری اس بھول چوک کے لیے اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہمیں معاف کرے۔''

''—— پھر باقاعدہ وہیں دعا مانگنا شروع کر دیا، جس میں اس قسم کے تمام شرور و فتن سے پناہ مانگی گئی، شیطان اور اس کے گرگوں سے نجات حاصل کرنے کی طلب کی گئی۔ ان سب رقت آمیز دعاؤں پر سب بچے زور زور سے آمین آمین کہہ رہے تھے۔!''

''—— مولانا انور قاسمی کی ان باتوں پر سب تالیاں بجا کر اسلام زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ جوش ایسا تھا کہ جیسے وقت نے ان سے تحفظ اسلام کا تقاضا کر لیا ہو اور اب یہ سرفروشان سر سے کفن باندھ کر تیار ہو گئے ہوں۔ مگر مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، نہ میں نے ان دعاؤں پر آمین کہی، نہ تالی بجائی اور نہ نعرہ لگایا۔''

''—— میں اپنے کمرے پر آ کر بہت رویا، مجھے روتا دیکھ کر کمرے کے دوسرے ساتھی میرے پاس آئے اور حال چال پوچھنے لگے، میں نے انھیں بخار کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ کئی دن تک میرا من نہیں لگا، مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر اس ماحول سے عجیب سا ڈر لگ رہا تھا جس میں اپنے جیسے ہی ایک مسلمان کو نہ جانے کس کس کا ایجنٹ بنایا جا رہا تھا اور ان کی پیٹھ پیچھے، ان کی شخصیت اور وجود پر الزامات لگائے جا رہے تھے۔ کبھی یہ خیال آتا کہ یہ ہماری نوخیز نسلوں کو کس ماحول کا پابند بنایا جا رہا ہے اور دنیا و ملک سے ہمیں کیوں کاٹا

جارہا ہے، ان خیالات نے میرا سینہ اور گلا دونوں گھونٹ دیے تھے۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ وہاں میرہم نوا بھی کوئی نہ تھا۔ وہاں تو سب اس خیال کے لوگ تھے:

ہمیں دنیا سے کیا مطلب مدرسہ ہے وطن اپنا!
مریں گے ہم کتابوں پر، ورق ہوگا کفن اپنا!!

کبھی وہ اپنی جان اور جسم کے بارے میں کہتے:

در حقیقت اس کا مالک ہے خدا!
پاس میرے یہ امانت ہے ذرا!!

اس سے آگے ان کی سوچ وفکر کسی طور نہیں بڑھتی تھی، یا شاید وہ بڑھانا گناہ سمجھتے تھے۔ وہاں کے بچے اسی ذہنیت کے ساتھ جیتے تھے اور اسی کیف میں رہنا انھیں اچھا بھی لگتا تھا، ان کا مزاج ہی ایسا بن گیا تھا کہ اگر کوئی انھیں کہتا بھی کہ اپنی اس حالت سے نکل آؤ تو وہ اس کہنے والے کو ایسی خونخوار نظروں سے دیکھتے جیسے اس نے ان کے ''ایمان'' پر ڈاکہ ڈال دیا ہو...''

یہاں تک آتے آتے میری اور نوین کی آنکھیں بوجھل ہوگئیں اور اس داستان کا اگلا حصہ کل کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ پھر پورے راستے ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ سیدھے کمرے میں آکر بستروں پر دراز ہوگئے۔ آج زیادہ دیر تک ہم نے باتیں کی تھیں لہٰذا سلیپنگ ٹائم آنکھوں میں آکر اپنی موجودگی کا احساس کرا رہا تھا اور نیند کی حسین دیوی خود کو منانے کے لیے رقص کرنے لگی۔ وہ ناچتی رہی اور ہم جانے کب سوگئے۔ وہ ہماری ادھ کھلی پلکیں بند کرتی ہوئی جانے پھر کہاں چلی گئی۔

○○○

www.urduchannel.in



تیسرے دن کا سورج اپنی سختی اور تمازت سے محروم ہوکر مغرب کی طرف جھکتا جارہا تھا کہ پھر وہی رنگ روڈ، وہی میں، وہی نوین اور وہی ہماری باتیں۔

''—— نوین! مدرسوں کے سسٹم اور کیمپس [احاطے] میں کسی بھی درجے کے اساتذہ خود کو حاکم سمجھتے اور معصوم طلبا سے گھناؤنی خدمات لیتے ہیں۔ احتجاج یا انکار کرنے پر اولاً تو بد تمیزی اور بدتہذیبی کا نام دیا جاتا پھر محرومی اور دوزخی کا لیبل لگا دیا جاتا، بچے نہ چاہ کر بھی ان کے کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ خوب صورت یا ہینڈسم سا ہوتا ہے تو اساتذہ اسے اپنا خادم بنانے کے لیے آپسی میں لڑائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ جب کہ اس معصوم کو اس کی کوئی خبر تک نہ ہوتی، پھر جو فریق اس لڑائی میں ہار جاتا ہے وہ اس بچے کا دشمن بن جاتا ہے۔ اگر اس کے پاس اس معصوم کی کوئی کلاس یا کتاب ہوتی تو اس کا فیل ہونا لازمی ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس طرح اس معصوم کا کریئر تباہ کر دیتے ہیں۔ وہ عجیب سی گھٹن کا ماحول تھا۔ معمولی معمولی خطا پر استاذ، بچوں کی پیٹھ پر قمچیوں سے نیل ڈال دیتے تھے۔ جسے وہاں کے 'منتظمین' 'عبرتناک سزا'' کہتے تھے اور ان کے ہم نوا ''مار پڑنے والے حصوں کو جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے کا'' لالچ دے کر اس سزا کو ہنسی خوشی قبول کروانے پر اکساتے۔ جب بھی ایسا کوئی ناخواشگوار واقعہ رونما ہوتا، میں اس دن بہت روتا، بہت افسردہ رہتا۔ پتا نہیں یہ کیسی مردم سازی ہوتی تھی ہماری؟ یہ ہمیں کیسا آدم گیری کا سبق پڑھایا جاتا تھا اور ہمیں کس طرح سماج کی منہ زور شعلوں والی آگ میں بغیر تیاری کے جھونکا جارہا تھا؟''

''—— وہاں کے معاملات پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا تھا۔'' میں نے آگے کہنا شروع کیا۔

''—— اس قسم کی جرأت کرنا وہاں بغاوت کہلاتا ہے اور باغی کی سزا وہاں بہت عبرت

ناک ہوتی ہے۔ پورا سسٹم ہی ان کا تھا۔ بچوں کے ماں باپ نے تو ایک جملہ سیکھ لیا تھا جسے وہ داخلہ کرتے وقت کہتے:

''—— استاذ جی! اب یہ بچہ ہم نے آپ کو دے دیا، آپ اسے ماریں، پیٹیں، کچھ بھی کریں، ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں...!'' حالاں کہ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کسی بھی حال میں ہمارے بچے کو پڑھا دیجیے، تعلیم یافتہ بنا دیجیے، جس کا مطلب وہ لوگ غلط نکال لیتے۔ پتا نہیں وہ اس طرح سے اپنے کس جذبے کی آسودگی کرتے تھے اور کس ناکردہ حسرت کی داد حاصل کرنا چاہتے تھے۔''

''—— چنانچہ اسی ماحول، خوف اور اسی نارسائی و محرومی کا لبادہ زیب تن کر کے جب ہم لوگ [پندرہ بیس طلبا کی جماعت] سات سالہ کا کورس پورا کر کے اس مدرسے سے باہر آئے تو یہ تک نہیں پتا تھا کہ ہمارے ملک کا وزیر اعظم کون ہے اور راجستھان سرکار کا وزیر اعلا کون؟ قومی اور ریاستی حکومتوں کا طرز حکومت کیا ہے اور وہ کس طرح اختیارات کا استعمال کرتی ہیں۔ ٹیکس کس طرح وصول کیا جاتا ہے؟ بجٹ کی کیا توضیحات ہوتی ہیں، نیز ان کے فیگر کس طرح بنائے جاتے ہیں؟ تجارت و معیشت کیا ہیں اور ان سے ملک کی اکنامی کا کیا رشتہ ہے۔ اقلیت اور اکثریت کیا بلائیں ہیں۔ سرکاریں اور انتظامیہ کیسے کام کرتیں ہیں؟ عوام اور سیاست کیا ہیں؟ ضلع کیا ہے اور ضلعی انتظام کا سربراہ کون ہوتا ہے؟ پولیس کے ہاتھ میں کیا کیا پاور ہوتا ہے؟ اور ان سے ہم کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں؟ ووٹ بنک اور سیاست کا آپس میں کیا رشتہ ہے اور سیاست میں ان کا کنٹری بیوشن کیا ہے۔ یہ تو بہت بڑی باتیں تھیں، ہمیں یہ تک نہیں پتا تھا کہ ہماری زندگیوں کا کیا مقصد ہے؟ ہمیں آگے کیا کرنا ہے اور سماج کے کس دھارے سے خود کو جوڑنا ہے؟ مسجد و مدرسہ قائم کرنا ہے یا کھیتی

www.urduchannel.in



باڑی کرنی ہے؟ سماج سے جڑ کر رہنا ہے یا کٹ جانا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے ہم پر سماج کے کیا کیا حقوق واجب ہوتے ہیں اور ہم انھیں کیسے پورا کریں؟ یہ اتنے سارے سوال ہمارے سامنے اچانک اور غیر متوقع طور پر آ کھڑے ہوئے تھے، جن کا نہ تو جواب ہمارے پاس تھا اور نہ ہی جواب دہی و جواب خواہی کا شعور۔ ہاں اگر کچھ تھا تو وہ ذہنوں میں بسی نصیحتیں، درس گاہوں میں سنی تقریریں ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی'' کی تلقینیں اور ہاتھوں میں رکھی بھاری بھاری کتابیں تھیں جن کی سطور، بین السطور، حواشی و تعلیقات تک میں لکھا تھا کہ بس کچھ ہی ساعات میں قیامت کا صور پھنکنے والا ہے اور دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں و زیبائیوں سمیت بہت جلد تہس نہس ہونے ولی ہے۔ اس کا حسن، اس کا نشہ، یہ سب فریب اور لہو و لعب ہے۔ یہاں کا سب کچھ بے حیثیت اور فانی ہے۔ لہٰذا اس میں گزرنے والی چند روزہ زندگی کو ایسے گزار دو جیسے کوئی اجنبی یا کوئی مسافر زندگی گزار دیتا ہے۔ دنیا کا تعارف ہمیں ایسے کرایا گیا جیسے کوئی خوب صورت عورت آگے سے زرق برق، ریشمی و گوٹے دار لباس زیب تن کیے ہوئے ہو اور پیچھے سے وہی لباس تار تار ہو گیا ہو۔ اس عورت کے چند دانت بھی ٹوٹے ہوئے ہوں۔ یعنی اس کا آگے کا جلوہ پر فریب اور جب اس کے پیچھے بھاگیں تو بھاگنے والوں کو چند چیتھڑوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگے۔ دانت ٹوٹنا، دنیا کو ٹھکرانے والوں کا اشارہ تھا۔ یعنی ان کی ٹھوکروں سے ''خانم دنیا'' کے چند دانت ٹوٹ گئے۔ پھر ہمیں بتایا گیا کہ ہمیں بھی دنیا سے اسی طرح پیش آنا چاہیے، جب جب وہ ہمارے سامنے آئے، حقارت سے ٹھوکر مار کر اس کے دانت توڑ دینے ہیں۔ اسے جھڑکنا ہے، اسے دھتکارنا ہے۔ خود کو اس سے کوسوں دور رکھنا ہے۔ اس سے خود کو اور دوسروں کو بچانا ہے۔''

یہاں آ کر نوین ہنسنے لگا، ویر تک ہنستا رہا—— آج ہم پی ایس آر آنے کے بجائے وی سی

گیٹ کی جانب مڑ گئے اور آئی آئی ایم سی کے جنگل میں ایک سرخ رنگ کی نیل گائے کو دیکھنے لگے جو ارد گرد سے بے خبر کچر کچر کچی گھاس کھا رہی تھی۔ میں نے اپنا ایم.آئی. ،نوٹ۔5 پرو، موبائل نکالا اور جھٹ جھٹ اس کی تین۔ چار تصویریں لے لیں۔ اسے پتا چلا تو وہ ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پتا نہیں کیا تھا، شرارت یا غصہ؟ جو بھی تھا، وہ سمجھے، ہم تو اپنی باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

''ہاں ہاں! جاری رکھو یہ داستان جاری رکھو!''

''—— ڈوڈ! یہ تو کچھ بھی نہیں، جس طرح اسکولوں اور ہمارے جے این یو کی دیواروں پر نعرے اور سلوگنس لکھے ہیں، اسی طرح دنیا کی بے ثباتی اور بے مائیگی، ذہن نشین کرنے کے لیے مدرسے کی دیواروں جا بجا یہ اشعار کندہ تھے۔'' میں نے نیل گائے تصویریں زوم کر کے دیکھتے ہوئے کہا۔

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے!
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے!!

○○○

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا!
آدمی بلبلہ ہے پانی کا!!

○○○

دنیا کے اے مسافر منزل تری قبر ہے!!
طے کر رہا ہے جو تو، دو دن کا یہ سفر ہے!

○○○

www.urduchannel.in



ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے!
کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے!!

○○○

''—— ان جیسے اشعار اور ان کے رقت آمیز انداز قرأت نے ہمیں عجیب سی دیوانگی بلکہ بے خودی میں مبتلا کر دیا۔ ان اشعار پر روزانہ نظر پڑنے اور ان کے ''لاشعور'' میں بیٹھنے کا جو نفسیاتی نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ انسان کو ناز و انداز دکھانے، مغرور اور معزز ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ سوٹ بوٹ، ٹائی پہننا، بال بنانا، جسم کی نمائش کرنا حرام ہے۔ سماجیات دھوکہ اور فراڈ ہیں۔ سوسائٹی اور اس کے اصول خدا کی طرف سے نہیں بلکہ شیطان کے بندوں کے بنائے ہوئے ہیں جن کی ہمیں مخالفت کرنی ہے۔ یہ ایمان کا پہلا درجہ ہے، دوسرا یہ کہ ہم اسے ہاتھ سے روکیں اور تیسرا یہ کہ ہم اسے دل سے برا جانیں، نیز یہ کمزور ترین ایمان کی علامت ہے۔ کہیں بھی غلط ہوتا دیکھو، بس شروع ہو جاؤ۔ کوئی مان تو اچھا ورنہ سمجھو اپنا فرض تو پورا ہو گیا باقی یہ سمجھیں۔ زندگی بھر اللہ اللہ کرتے رہو اور اگر دنیا والے روکا وٹ ڈالیں تو پہاڑوں و جنگلوں میں چلے جاؤ۔ اور اسی عالم و کیف میں جان جان آفریں کے حوالے کر دو۔ پھر بھی تمھیں یہ احساس رہے کہ ''حق ادا نہ ہوا!'' دنیا کو چاہے تمھاری کتنی ہی ضرورت ہو، تمھیں اس کی طرف نہیں دیکھنا ہے، اس لیے کہ وہ تمھارے ایمان اور اعتقاد کی دشمن ہے اور سراسر فریب ہے۔ اللہ کے بندوں کی شان یہ ہے کہ وہ دھوکہ نہیں کھاتے، فریب نہیں کھاتے۔ ان اشعار اور اس ماحول نے ہماری آنکھوں کے آگے دنیا کو بے حقیقت اور بے حیثیت کر دیا۔ اب ہمیں دنیا سے ہی خوف آنے لگا اور دنیا سے اس طرح نفرت ہوتی گئی جیسے کسی ناپسندیدہ چیز سے ہو جاتی ہے۔''

''—— اسی وقت ہمارے معصوم و سادہ لوح سینوں میں مسلکوں اور فرقوں سے نفرت کا

بیج بھی بو دیا گیا، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی، آزاد خیال طبقات کے تعلق سے مناظرہ کر کے ہم خوب کافر کافر کھیلتے تھے۔ اسی طرح سوٹڈ بوٹڈ کلچر، خوشی، تیوہار، جشن، رقص ومستی، موویی، سنیما، کرکٹ، ادب، فکشن، اخبار بینی و خوانی، ہندی، انگلش، سنسکرت، سائنس، سب سے اس قدر متنفر کر دیا گیا کہ جیسے جرائم سے کیا جاتا ہے اور جیسے یہ ہماری دنیا کی چیزیں نہ ہوں۔ نیز ان کا تصور بھی ہمارا ایمان وعقیدہ سلب کر کے ہمیں جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں پھینک دے گا۔ کہیں کہیں ان کتابوں میں یہ تعلیم بھی دی گئی کہ کسی قبول صورت کو پہلی نظر دیکھنے پر کوئی گناہ نہیں، مگر دوسری، تیسری بار دیکھنے پر سخت سزا ملے گی۔ لہٰذا ایک نظر ڈال کر نظر ہٹاؤ ہی مت! حلالہ کس طرح کیا جاتا ہے اور حیض وطہر کے مسائل کیا ہیں۔ شراب کی تمام قسمیں اور صورتیں نشہ آور ہیں اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ غلام باندیوں کی اسلام/شریعت میں کیا حیثیت ہے اور ان کے آقاؤں کو ان پر کیا کیا اختیارات دیے گئے ہیں، وہ کس کس طرح ان سے فائدے اور استفادے حاصل کر سکتے ہیں۔ زید کے غلام باندی اگر بھاگ گئے تو ان کی سزا شریعت میں کیا ہے وغیرہ۔ ابتدا سے آخر تک ''زید نے عمرو کو مارا'' بے چارے کو کیوں مارا؟ کچھ نہیں پتا؟ ان کتابوں کے ابواب میں احکامات و فرائض میں نماز وروزہ، حج زکوٰۃ سے لے کر عطیہ وتحائف کے اصول وضابطے بتائے گئے۔ ادا اور قضا کی کیا حیثیت ہے۔ نکاح وطلاق کے مسائل ہمیں اس وقت پڑھائے گئے جب ہمارے جسموں کے بعض حصے بھی مردانیت سے عاری تھے اس وقت ہمیں کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرم وحیا آتی تھی۔ ہمارے چہروں اور آنکھوں کے جاذب نظر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے جسموں کی ساخت بھی ایسی ہی تھی۔''

''—— میں اب تک سوچتا ہوں کہ وہ مسائل جن پر مدارس کی درسگاہوں میں گھنٹوں

www.urduchannel.in



گھنٹوں بلکہ کئی کئی دن تک بحثیں ہوتی تھیں، اسی طرح وہ ہمیں رٹائے جاتے تھے اور ان کے حوالوں سے مناظرے کرائے جاتے تھے۔ وہ ہمارے کیا کام آئے۔ جیسے آمین بالجہر والسر، رفع یدین، امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا، نہ پڑھنا۔ بیع و شرا، طلاق وعتاق، غلام باندی وغیرہ۔ ان مسائل کی مدارس سے باہر کہاں ضرورت ہے؟ یا انھیں کہاں نافذ کیا جاسکتا ہے؟ جس وقت ملک بھر میں بلکہ پوری دنیا میں پانی کا شدید بحران ہے اور تیسری جنگ عظیم برپا ہونے کے آثار، اسی مسئلے پر دکھتے ہیں۔ ایسے وقت میں کس سے یہ کہا جائے کہ بلّی اگر چوہا کھا کر پانی میں منہ ڈال دے تو اس پانی کا حکم کیا ہوگا؟ ایسے وقت میں جب ندیوں اور سمندروں میں فیکٹریوں اور شہروں کا ملبہ ڈالا جارہا ہے، اس وقت کسی کو یہ کیسے بتایا جائے کہ کنویں میں اگر چھوٹا بڑا جانور گر جائے تو کتنے ڈول پانی کھینچنے سے وہ پاک ہوجائے گا۔''

''—— ایک طرف یہ کتابیں تھیں اور دوسری طرف دنیا، جسے ہم نا کے برابر جانتے تھے۔ چنانچہ دنیاداری سے عدم واقفیت نے بہت عرصے تک ہمیں مجنوں بنائے رکھا یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہمارے کان کتر جاتے اور ہم چیں بہ جبیں ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ ہم پر پھبتیاں کستے اور ہمیں طعنے دیتے اور ہم کسی نفسیاتی مریض کی مانند چڑچڑاہٹ کی آخری انتہا تک پہنچ جاتے تھے۔ اسکولوں کے ذہین بچے ہم سے جنرل نالج کے سوال پوچھتے اور ہم بھری محفل میں رسوا ہوجاتے۔ پھر کوئی کہنے والا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا:

''—— ارے بھائی ان نے مدرسان کا ای ٹکڑ توڑائیں، ان سو دنیا مت، دین پوچھو بس، یہ وائی کا بارا میں بتا سکیں۔ [ان لوگوں نے مدرسوں کے ٹکڑے توڑے ہیں ان سے اسی کے بارے میں پوچھو، یہ اسی کے متعلق بتا سکتے ہیں...] اور پھر ہماری عزت دو کوڑی کی

ہوکر خاک میں مل جاتی۔ہمیں ایسا لگتا جیسے ہم پر گھڑوں پانی گر گیا ہو۔ہم خود کو ایسے مجرم سمجھتے جیسے کوئی گناہ کرلیا ہو اور اب جواب دینے کے لیے کسی کے سامنے کھڑے ہوں ۔واقع ہم نے جرم کیا تھا۔ہم اس وقت دنیا کے سامنے کھڑے تھے،جو پوچھ رہی تھی تم میرے گھر کیوں آئے؟ یہاں کیا لینے آئے ہو؟!تمھارا گھر تو مدرسہ ہے نا،مروجا کر وہاں!! دنیا ہمیں ڈانٹ رہی تھی اور ہم نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ہم مدرسوں میں بھی نہیں جاسکتے تھے۔وہاں کے دروازے تو ہمارے اوپر اس وقت ہی بند ہوگئے جب مدرسے والوں ہمیں ایک سٹرفکیٹ تھما دیا اور ہمیں گائے،بھینس،بکریوں کی طرح جنگل میں ہانک میں دیا تھا۔

○○○

www.urduchannel.in



## (4)

### دلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب——

ایک طویل عرصے بعد جب دنیا داری،سیاست،سماج،فرقہ وارانہ ہم آہنگی،پارلیمانی حکومت اور منڈی و مارکیٹ کے ریٹ سمجھ میں آئے،اس کے بعد دلّی میری منزل بنی۔دلّی آنے سے پہلے میں ایک بار اپنے کچھ دوستوں کو لے کر گاؤں کے تالاب پر گیا۔پورا تالاب سوکھ چکا تھا۔بس اس کے تلے میں تھوڑا سا گدلا پانی بھرا تھا جس کا رنگ دھوپ سے جل کر چائے کی طرح ہوگیا تھا اور کناروں پر ہری ہری کائی کی تہیں جمی ہوئی تھیں ۔ میں نے نیم کے اسی بوڑھے پیڑ کے نیچے ان کے ساتھ کھیلنے کی خواہش کا اظہار کیا جہاں ہم بچپن میں کھیلتے تھے۔اس خواہش پر ان کا ردعمل ان میں سے چند کا وہی تھا جو پریم چند کے افسانے''گلّی ڈنڈا'' کے''گیا'' کا تھا۔چوں کہ ہم بچے اب کچھ بڑے ہو چلے تھے اور کچھ کچھ شعور بھی بالغ ہو رہا تھا۔ان میں مشتاق،اجرو،راجیش،کی تو شادی بھی ہو چکی تھی۔

کھیل ختم ہونے کے بعد میں نے پھر ان سب سے آٹھ سال پرانی بات کہی۔''میں دلّی جاؤں گو[گا]''—— میری اس بات پر وہ سب مجھے اس طرح دیکھنے لگے جیسے میرے مائی باپ اور میرے بزرگ ہوں اور میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جوان کی روایت،رواج اور قدروں کے منافی ہو۔وہ مجھے اسی آٹھ سال پرانے والے انداز میں سمجھانے لگے۔پھر

وہی میرے پاگل پن کی بات۔ وہی دلّی کی دوری اور اس کی ہولناک خبریں، پھر وہی گھر والوں کو بتانے کی دھمکی۔ پھر وہی میوات میں ہی رہنے کی ذہن سازی۔ وہ کہہ رہے تھے:

''—— تُو پاگل مت بن! ہم سب یہیں رہیں گے، یہیں بھینسیں چرائیں گے اور یہیں کھیتوں میں پھاوڑے اور درانتیاں چلائیں گے.....ان کا لہجہ سخت ہوتا گیا.....تم نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ آیا بڑا دلّی جانے والا، تیرے گھر والے تیرا جو حال کریں گے، اس کے بارے میں بھی سوچا ہے۔''

وہ کہتے ہی رہے—— مگر میں نے دلّی جانے کی ٹھان ہی لی۔ اب جو ہونا ہوگا، وہ ہو کر رہے گا، مجھے اس کی پروا نہیں۔ میرے ان دوستوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے سمجھایا بلکہ گھر والوں سے بھی میرے ارادوں کے متعلق بتا دیا۔ اس کی پاداش میں مجھے دو دن کھانا نہیں ملا۔ تیسرے دن کا سورج طلوع ہوتے ہوتے میں بس میں سوار دلّی پہنچنے ہی والا تھا۔ میرے خوابوں کی دلّی اونچے اونچے ملٹی اسٹوری بنگلے اور ولاز، اپارٹمنٹس اور اسکوائرس، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے عالی شان شورومز، سڑکوں پر چلتی چمکتی دمکتی کاریں سورج کی اولین کرنوں سے دمکتی ہوئی سڑکیں، مجھے سلام کہہ رہی تھیں اور میں آنکھوں کے خفیف اشاروں سے ان کے سلاموں کا جواب دے رہا تھا۔ دلّی میں، میں کسی کو بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی دلّی مجھے جانتی تھی مگر میں دلّی کو بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔ دلّی کے خواب جاگتی آنکھوں سے میں نے دیکھے تھے، دلّی کی اڑتی اڑتی خبریں سنی تھیں میں نے۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ اس وقت تک میں دلّی کے اچھے پہلوؤں کو جانتا تھا، مگر اس کے حقیقی پہلو پرت در پرت جو میرے سامنے کھلے، انھوں نے ایک بار تو میرے قدم ہی اکھاڑ دیے۔ ان ہی دنوں میرے ناتواں وجود پر دلّی اپنی پوری طاقت اور شدت سے گر پڑی تھی۔ یہاں کے راستے، یہاں کی

www.urduchannel.in



گلیاں، یہاں کی دیواریں، یہاں کے سائے میری طرف ایسے دوڑنے لگتے جیسے بے خبر ہرن کے پیچھے بے شمار تیندوے دوڑ پڑتے ہیں۔ مگر دلّی میری ضد تھی۔ میری انا اور میرا غرور تھی دلّی۔ میری منزل تھی دلّی۔ لہٰذا میں دلّی کی ان نارسائیوں کو جھیلتا گیا۔ مجھے دہلی کے ابتدائی دنوں میں ایک بزرگ نے بھی کہا تھا:

''—— بیٹا! تم دلّی تو آ گئے ہو مگر یاد رکھو، یہ ایسا شہر ہے جو اپنے نو وارد کے قدم اکھاڑ دیتا ہے مگر جو ان حالات میں ثابت قدم رہا، دلّی پھر اسے اپنا کر ایسا نوازتی ہے کہ اس کی نسلیں یہاں آباد ہو جاتی ہیں۔ میں یوپی سے چند روپے لے کر اب سے پچاس سال پہلے یہاں آیا تھا اور اب یہاں نہ صرف میرا اپنا ذاتی مکان ہے بلکہ میرے لڑکے لڑکیاں بھی دلّی کے مختلف علاقوں میں آباد اور خوش حال ہیں.....''

یہ باتیں مجھے حوصلہ دیتی گئیں اور میں دلّی کے جسم میں سماتا گیا۔ دلّی کا بار بار ریپ ہوتا رہا۔ دلّی بار بار رسوا ہوتی رہی، دلّی میں آگ لگتی، افواہیں اڑتیں، آنر کلنگ اور سنیچرنگ کے واقعات دن دہاڑے رونما ہوتے رہے، اس کے باوجود بھی دلّی مجھے پیاری رہی۔ مجھے دلّی سے اس وقت بھی پیار رہا جب میں نے شاہد احمد دہلوی کا رپورتاژ ''دلی کی بپتا'' بار بار پڑھا۔ میں نے غدر کے خوں چکاں حالات پڑھے، پھر بھی مجھے دلّی سے نفرت نہ ہو سکی۔ میں یہاں کی اردو دنیا سے وابستہ ہو گیا۔ یہاں کے اخبارات سے وابستہ ہو گیا۔ یہاں کے ادبی حلقوں میں آنے جانے لگا، یہاں کے عالمی طرز کے ملٹی فلیکس آڈیٹوریم میں منعقد ہونے والے ادبی پروگراموں میں شریک ہونے لگا۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا۔ یہیں میں نے فاصلاتی طریقوں سے اعلا عصری تعلیم کے سلسلے شروع کر دیے۔ اخباروں میں دنیا جہان کی خبریں، سیاست کی اتھل پتھل، اقتدار کے تختہ پلٹ کی نیوز، باغیوں کی

سرزنش یا باغیوں کے ذریعے حکومتوں کو اکھاڑ پھینکنے کی خبریں، کھیل کود و تفریحات سے آگاہی، تصویروں اور آرٹ میں موجود تخلیقی اور تجریدی عناصر سے واقفیت اور شعور و آگہی مجھے یہیں نصیب ہوئے۔ میں اخبارات میں کبھی سب ایڈیٹر تو کبھی پیج میکر بنتا۔ کبھی نیوز رپورٹر بن کر ادبی اور سیاسی تقریبات کی کوریج کرتا، پرائیویٹ کمپنیوں کے اشتہارات لاتا، کبھی **DAVP** سے انگریزی و ہندی میں اشتہارات آتے تو ان کے ترجمے کر کے اخبار کے حوالے کرتا۔ دن کے دو تین بجے سے اخبار کا شروع ہونے والا یہ کام رات گئے بارہ بجے تک ختم ہوتا۔ آفس سے باہر آتے ہی دلّی خاموش، رات کی تنہائی اور تاریکی اس کی بلند بلند عمارتوں کی جڑوں تک آئی ہوئی ہوتی۔ اس تنہائی اور تاریکی میں نہ آٹو، نہ بسیں، نہ کوئی اور سادھن، لکشمی نگر سے دریا گنج پہنچنا کتنا مشکل ہوتا تھا جب میں پیدل جمنا پل سے پہنچتا تھا۔ مگر یہ روز روز کا سفر اور یہ مشکلیں بھی میرے قدم نہ اکھاڑ سکی۔

ایک طرح سے دلّی نے مجھے دوسرا جنم دیا تھا۔ یوں اگر میں دلّی کو اپنی مجازی ماں یا تجرباتی باپ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ من باؤرا ہوتا گیا اور دلّی کے نئے نئے روپ آنکھوں کے سامنے آتے گئے۔ یہاں کی بسوں میں دھکے کھانے، جیب کٹنے، پسینے اور گرمی میں ایک پیر پر کھڑے رہنے، یہاں کی سڑکوں پر میلوں پیدل چلنے اور امس بھری فضا میں سانس کی گھٹن کا احساس ہونا بھی اچھا لگنے لگا۔ دلّی میرے سامنے رنگ روپ بدلتی رہی، مجھے کبھی رُلاتی، کبھی سہلاتی رہی، لبھاتی رہی، مجھے اپنی آغوش میں سماتی رہی اور میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتی رہی۔ جس دلّی کا میرے دوست مذاق اڑتے تھے، میں اسی دلّی کو نہایت قریب سے بلکہ اس کے پیٹ میں بیٹھ کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہاں ہونے والی وارداتیں گھروں کے معمولی واقعات جیسی لگتیں۔

www.urduchannel.in



ان دنوں دلّی شیلا دیکشت کی دلّی تھی۔ کامن ویلتھ گیمس کی رنگا رنگی اور جمنا ندی کے کنارے اکشر دھام مندر کے جلو میں کھیل گاؤں کے جدید کمپلیکس کی جنگی پیمانے پر تعمیر اور عالمی معیار کی تشکیل میرے سامنے کی باتیں ہیں۔ ان دنوں، دلّی بیرونی اتھلیٹکس، ہاکی بازوں، ویٹ لفٹرس، فٹبالر، بیڈمنٹین غرض مختلف زمروں کے کھلاڑیوں کے استقبال کے لیے دلہن کی طرح سجی سنوری کھڑی تھا۔ ڈی ٹی سی کی ''لال پریوں'' پر کامن ویلتھ گیمز کے عالمی سمبل 'شیرا' کی تصویریں مختلف گیمز کے ساتھ چسپاں کی گئیں۔ کسی میں وہ فتح کی دو انگلیاں اٹھائے ہوئے، کسی میں ہاکی کھیلتے ہوئے، کسی میں ویٹ لیفٹ کیے ہوئے تو کسی میں اسٹریپس پر دوڑتے ہوئے۔ یہ بسیں جہاں جہاں سے گزرتیں، لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا جاتیں۔ اس کے علاوہ نئی دہلی کی اہم سڑکوں اور اسٹریٹس پر ''**CWG DELHI-2010**'' پینٹ کیا گیا۔ ایونٹس کے انعقاد کے لیے ''جواہر لال اسٹیڈیم، دہلی یونیورسٹی اسپورٹس کمپلیکس، آر کے کھنا اسٹیڈیم اور کھیل گاؤں کے متعدد میدان منتخب کیے گئے جن میں یہ ہنگامہ **3** اکتوبر سے **14** اکتوبر **2010** تک قریب بارہ دن برپا رہا جس میں **71** کامن ویلتھ ممالک کے **6,089** اتھلیٹکس نے **272** ایونٹس میں شرکت کی۔

ان کھیلوں کو پرامن طریقے سے منعقد کرانے کے لیے دلّی پولیس نے سیکوریٹی کے سخت انتظامات کیے تھے۔ ہر اسپورٹ کمپلیکس کے آس پاس کے علاقے کو دفعہ۔144 سے گھیر دیا۔ پیرا ملٹری اور انڈین آرمی کی کئی کئی رجمنٹس اور بٹالین کے زمینی پریڈیئر اور فلائنگ اسکواڈ دلّی کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے تھے۔ جو دلّی کے زمینی اور فضائی جغرافیے پر اس طرح نظریں گڑائے ہوئے تھے کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔

میں نے ان تمام مقابلوں اور پروگراموں کی بطور اسپورٹ رپوٹر، رپورٹنگ کی اور اپنے

اخبار کا پیٹ بھرا۔ گیم ختم ہوئے۔ دلّی نے ہنگاموں سے راحت کی سانس لی۔ سال **2010** ختم ہوگیا، یعنی نئی صدی کا پہلا عشرہ۔ پھر نئی صدی دوسرے عشرے کے پہلے برس میں داخل ہوگئی۔ وقت کا کارواں آگے بڑھتا رہا....

دلّی ابھی کامن ویلتھ گیمز کی کامیاب میزبانی اور حسین اختتام پر جشن منا رہی تھی کہ ان ہی دنوں ایک خبر نے قومی، بین الاقوامی اور سوشل میڈیا میں ہلچل مچادی جس کے بعد دلّی کا سر شرم سے جھک گیا۔ گو دلّی کے لیے یہ معمول کا حادثہ تھا مگر مجھ جیسے نواردوں کو تو اس نے اوپر تلے سے ہلا ڈالا۔ بات یہ تھی کہ انڈین اولمپک ایسوسی ایشن اور **CWG** کمیٹی کے سربراہ سریش کلماڈی پر کروڑوں کے فراڈ اور غبن کے الزامات لگنے لگے، صداقت تو خدا جانے مگر سی بی آئی کی جانب سے اولین گرفتاری اور کلماڈی کے آئی اوا ے سے ریزائنگ نے کلماذی کے مجرم نہ ہونے کے تمام در بند کردیے۔ ریڈیو، ٹی وی اور دیگر سوشل سائٹس پر **#سریش کی الماری** کی خبریں، ہیش ٹیگ اور سلوگنس چلنے لگے۔ کانگریس کو اس وقت منہ کی کھانی پڑی اور شیلا دیکشت کی پیشانی کی شکنوں میں دو چار فکر مند لکیروں کا مزید اضافہ ہوگیا۔ سر فخر سے بلند ہونے کے بجائے جھک گیا۔ اس کا اثر مرکز کی یو پی اے حکومت پر بھی پڑا۔ کابنی وزرا اور دیگر پارلیمنٹرین کے لیے نئی دہلی کے پوش علاقے منہ اور سر چھپانے کے لیے ناکافی ثابت ہو رہے تھے۔ دنیا بھر سے جو بدنامی ہو رہی تھی وہ الگ۔ اس سے اپوزیشن این ڈی اے کو شہ ملنے کے ساتھ ساتھ یو پی اے کے خلاف بیان بازیوں اور محاذ آرائیوں کے خوب مواقع مل رہے تھے۔

○○○

یہی وہ موقع تھا جہاں سے مرکز میں دس سال مسلسل راج کرنے والی یو پی اے اور دلّی

www.urduchannel.in



میں پندرہ سال حکومت کرنے والی کانگریس کا زوال شروع ہوگیا۔ آئے دن فراڈ پر فراڈ، گھوٹالوں پر گھوٹالے رونما ہونے لگے، کبھی کوئلہ بلاک سے حکومت کے ہاتھ اور چہرے سیاہ ہوتے تو کبھی 2۔جی اسپکٹرم کا جن، اس کی نیندیں اڑا دیتا۔ ہندوستان ان دنوں کرپشن کی فیکٹری بن گیا تھا۔ میں ان دنوں کا شاہد ہوں جب اخبارات، ٹی وی چینلس، سوشل میڈیا رات دن کانگریس کی کردار کشی اور اس کے قلعے کی بیخ کنی میں مصروف تھا۔ ہر زبان کا چھوٹا بڑا صحافی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے بجائے نہا رہا تھا۔ کانگریس کی مت بھی ماری گئی، وہ ایک ایک کر کے کرپٹ، بدعنوان اور ملکی املاک کو برباد کرنے والے نیتاؤں اور پارٹیوں کو کمان دے رہی تھی۔ اس طرح بعض سیاسی مبصرین کے مطابق کانگریس کا قلعے ڈھانے میں دشمنوں سے زیادہ خود اسی کا اپنا ہاتھ تھا۔ وقت نے اسے بار بار سنبھلنے کا موقع دیا، کئی بار اسے توبہ اور اعتراف گناہ کے چانس ملے، مگر وہ اقتدار کے نشے میں چور، پولیس ایکشن کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ اس کے زمانے میں پورا ملک پولیس اسٹیٹ بن گیا تھا۔ اقلیتوں کا جینا تو مشکل تھا ہی، متوسط شہری بھی اس سے عاجز ہوگئے۔ حکومت حق مانگنے والوں پر الٹے الزامات لگا رہی تھی۔ یعنی جیسے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ——

مرکزی حکومت کے کرپشن اور بدعنوانیاں جب حد سے گزریں تو مہاراشٹرا کے دور گاؤں سے ایک ضعیف العمر شخص سیاسی منظر نامے پر نمودار ہوا، اس کا نام ''انّا ہزارے'' تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے اہم مقامات پر ''انشن'' کر کے بدعنوانی اور کرپشن کے خلاف پورے ملک میں ایک تحریک چھیڑ دی۔ اس تحریک کا چھڑنا تھا کہ گھروں میں بیٹھے لوگ، عورتیں، بچے، سب ''آئی ایم انّا، یو آر انّا' وی آر انّا'' لکھی ہوئی سفید دو پلی ٹوپیاں پہن کر سڑکوں پر نکل آئے۔ وہ تحریک ایک منہ زور چنگھاڑ مارتی ہوئی طوفان تھی، جس کی شدت

سے، بہت دور سے ہی دلّی کا سنگھاسن ڈانواڈول ہو رہا تھا مگر اس پر براجمانوں کو لگ رہا تھا:

''دلّی ہنوز دور است---''

پھر ایک دن ان کی حیرانی کی انتہا نہیں رہی جب دلّی کا رام لیلا ''جے پی مومنٹ۔ 1984'' کی مانند میدان، قومی پرچموں، میڈیا کی ریل پیل، بیچوں بیچ انشن پر بیٹھے ''انّا ہزارے'' عوام کے جوشیلے اور سرفروش جم غفیر سے لبالب بھرا تھا۔ نوجوان، بوڑھے، مرد عورت بچے۔ سماج کے ہر طبقے کے افراد وہاں موجود تھے۔ وہ سب کرپشن کے خلاف ''مضبوط لوک پال بل'' مانگ رہے تھے دوسرے لفظوں میں حکومت کا احتساب کر رہے تھے۔ تاریخ نے اس مومنٹ کو ''انّا مومنٹ'' کا نام دیا ہے۔ اس مومنٹ نے جہاں حکومت کے ایوان ہلا دیے، وہیں ایک ایسی سیاسی پارٹی کو جنم دیا جس نے دلّی کی ناقابل تسخیر حکومت کو اکھاڑ پھینکا۔ اس کا طریقۂ حکومت گو محدود و مسدود رہا مگر اس نے جو بھی کیا، دلّی اس کا احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

کانگریس اس طوفان بلا خیز کے سامنے ہار مان گئی اور اس نے ''انا'' کی ڈیمانڈس جزوی طور پر قبول کر لیں۔ ''انا'' نے انشن توڑ دیا اور رام لیلا میدان کسی دوسری مومنٹ یا ایونٹس کے لیے خالی ہو گیا۔

○○○

''انا مومنٹ'' کا زور کچھ کم تو ہو گیا مگر وہ یو پی اے کے قلعے میں سیندھ لگا گئی۔ بالآخر وہ قلعہ منہدم ہی ہو گیا اور اس کی انہدامی پر آخری کدال اس دن چلی جب **2014** کے عام انتخابات میں یو پی اے کا مکمل صفایا ہو گیا۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ دیکھنے میں آیا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی بلکہ نریندر دامودر داس مودی کی قیادت میں این ڈی اے نے

www.urduchannel.in



اکثریت سے بھی اکثریت اور ناقابل تسخیر اقتدار حاصل کیا۔ بالاتفاق اس سرکار کے وزیر اعظم کے طور پر اعلان اور نامزدگی کے مطابق نریندر مودی کو منتخب کیا گیا۔

ہندوستانی عوام مودی سرکار کو اس کے ''اچھے دن آنے والے ہیں---اچھے دن آ گئے'' جیسے نعروں اور بیانات کے آدھار پر یو پی اے کے متبادل کے طور پر دیکھ رہے تھے، ان کی آنکھیں تو اس وقت کھلی کی کھلی رہ گئیں جب ریلیوں، اشتہاروں اور انتخابی جلسوں میں کیے گئے وعدے محض ''جملہ'' ثابت ہوئے۔ اسے جن امیدوں سے اقتدار سونپا گیا تھا، ان میں وہ صد فیصد ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد تاریخ داں کو بہت سے موضوعات و واقعات خود بخود ہی ملنے لگے۔ ہر دن طاقت و اقتدار کے نشے میں چور مودی سرکار، ملک کا بچا کھچا بیڑہ غرق کرتی۔ کبھی اس کبھی اس کی شہ پر کچھ شر پسند عناصر ملک کے قومی و سیاسی ہیروز کی شبیہ خراب کرتے یا ان کے مجسموں کو نقصان پہنچاتے۔ کبھی گائے کے نام پر ماب لنچنگ مچاتے، کبھی کچھ تو کبھی کچھ.....جس کے جواب میں ملک، کا نوجوان طبقہ، طلبا، کسان، عام آدمی، مزدور سراپا احتجاج بن کر سڑکوں پر آ جاتا۔ حالاں کہ اس احتجاج اور غم و غصے کا حکومت پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ دوسرے دن نیا و سخت فرمان جاری کر دیتی۔ جس سے عام زندگی کا گھیرا اور تنگ ہو جاتا۔ ''اچھے دنوں'' کی آمد دیوانے کا خواب بن کر رہ گئی۔ ان کی تلاش و طلب میں ہندوستانی عوام نے اپنے برے دن بھی گنوا دیے۔ بلکہ بعض تو کہتے ہیں کہ ہم اچھے دنوں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ''کچھے دنوں'' میں آ گئے۔ ہمارے تن سے کپڑے اور جسم سے رونق و زیبائی، سب چھن گئی۔

نومنتخب وزیر اعظم نے پہلے ہی دن سے عوام کو بے وقوف بنانا شروع کر دیا اور خود کو وزیر اعظم کہلانے کے بجائے خود ہی چوکیدار اور پردھان سیوک جیسے خطابات لے لیے۔ یعنی

چوکیدار کا مطلب یہ کہ اب ملک کے گھوٹالے بازوں کی خیر نہیں، نہ وہ ملکی اثاثہ باہر لے جاسکتے ہیں اور نہ ہی اسے خرد برد کر سکتے ہیں اور پردھان سیوک کا مطلب اس نے یہ نکالا کہ میں جنتا کی سیوا بڑے پیمانے پر کروں گا پورے پورے علاقے ترقی وخوشحالی کی غرض سے اپنی تحویل میں لوں گا۔مگر بعد کے واقعات سے اس کے اپنائے ہوئے یہ دونوں القاب بے حیثیت اور بے اثر ثابت ہوئے، نہ وہ ڈھنگ سے چوکیداری ہی کر سکا اور نہ ہی سیوا۔ وجے مالیہ، نیرو مودی اور چھوٹے چھوٹے جانے کتنے ہی گھوٹالے باز سرکاری فلائٹس سے ملک بدر ہوئے اور جنتا کو سیوا کا لابھ ملنے کے بجائے اسے نقصان ہی ملا۔

مودی سرکار کی ملک بربادی کی دیگر کوششوں میں سب سے اہم کوشش آزاد اور فعال اداروں کو پابند اور ان کے اختیارات محدود کرنا تھا جس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہی۔ ملک کے طول عرض میں غریبوں کا استحصال، کسانوں کی بربادی، مجبوراً خودکشیاں، آدھار سمیت دیگر بے کار کارڈس کا لزوم اور روزگار چھیننے کے امور تو دوسرے ہیں۔اس وقت تو ہندوستانی عوام کے ساتھ ساتھ ملکی معیشت کی بھی کمر توڑ دی گئی جب **9** نومبر **2016** کی رات کو ہندوستانیوں کے پاس ہی کالے دھن کی موجودگی کا شاخسانہ گھڑ کے، نوٹ بندی کا اعلان کر دیا گیا اور دوسرے دن سے یہاں کے غریب عوام اور دھاڑی مزدور بنکوں کے سامنے لائن میں کھڑے تھے۔ بہت کم ان میں سے ایسے ہوتے جنھیں پیسے مل پاتے اکثر تو پانچ پانچ دن تک پیسوں کا منہ نہ دیکھ پاتے۔وہ لائینیں ترقی کی لائینیں نہیں، بربادی اور بے حیائی کی لائینیں تھیں۔ پردہ نشین خواتین اور غیروں مردوں سے اپنا تحفظ کرنے والی غیرت مند خواتین بھی ان دنوں شرم وحیا کی چادریں اتار کر لائنوں میں لگی کھڑی ہوتی تھیں، جن کے عارض ولب اس سورج اور ہوا کی سختی کسی طور برداشت نہ کر سکتے تھے مگر پیٹ

www.urduchannel.in



کی آگ اور پیسوں کی طلب نے انھیں ان مصیبتوں کو جھیلنے پر مجبور کر دیا تھا۔انھوں نے نہ جانے کتنے غریبوں کی جانیں لے لیں۔ کتنے محروموں کے گھر اجاڑ دیے۔

نوٹ بندی نے غریبوں کی جانیں ہی لیں، اس لائن گردی میں ان کا ہی پیسہ بدلا، امیروں کے گھر تو خود بنکوں کے منیجر اور حکومت کے اہلکار پیسہ پہنچا کر آتے تھے، بسا اوقات تو بنک کے پچھلے دروازوں سے انھیں بڑے بڑے پیکٹس دے دیے جاتے اور سامنے کے دروازے پر مائک کے ذریعے اعلان کرا دیا جاتا ''**کیش ختم**'' یہ اعلان نہیں، بجلی گرتی تھی ان غریبوں پر جو صبح سے شام، شام سے رات اور رات سے صبح تک لائن میں لگے ہوتے تھے۔ان کا ہم درد وہاں کوئی نہیں تھا اور نہ ہی غمگسار وفریادرس۔ مسیحا کو تو ہوس پرست پہلے ہی مار چکے تھے۔ملک ہر دن کسی بے وقوف کی کرتوتوں کا خراج ادا کر رہا تھا۔ ملک تباہی کی طرف جا رہا تھا اور مؤرخ کا قلم ظلم وزیادتی، سماجی ناانصافی اور سیاسی پامالی کے ہر دن نئے صفحات رقم کر رہا تھا۔غریب ہی ملک میں مر رہے تھے اور نوٹ بند کا تغلقی فرمان دینے والا ملکوں ملکوں گھوم رہا تھا۔اسے صرف اپنی فکر تھی ملک، عوام، غریب، سب کچھ برباد ہو تو ہو، اس کی بلا سے۔

خدا خدا کے کر کے یہ طوفان تھما اور ملک نے یہ خوب صورت صحت مند کروٹ لی کہ اس پر مرکزی کی بی جے پی سرکار کی پھر بدنظر پڑ گئی۔اس بدنظری میں اس نے الیکشن کمیشن کو یرغمال بنا لیا اور اس کی کسٹڈی میں موجود/ محفوظ ای وی ایم مشینوں کو ہیک کر لیا۔اب گواہ ہو کہ چھتیس گڑھ، اتر پردیش ہو کہ منی پور، تری پورہ اور میگھالیہ سب جگہ اس نے سرکاریں بنانی شروع کر دیں اور کانگریس کا ہاتھ پھول سے بدلنے لگا۔ملک کے سیکولر طبقے نے اس مبینہ دھاندلی پر اعتراض بھی کیا مگر الیکشن کمیشن نے وہ تمام ثبوت ہی غائب کر دیے اور آر ٹی آئی

لگانے والے یا دوسرے معترضین اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ عدالت بھی ثبوت کی عدم دستیابی کے باعث **ECI** کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ ای سی آئی کی ہوشیاری عدالت کے ذریعے آرٹی آئی داخل کرنے والوں کو ملنے والے منہ توڑ جواب نے حکومت کے حوصلے مزید بلند کر دیے اور وہ ملک میں شر و فساد پھیلانے کے لیے آزاد ہو گئی۔ ان کی دنوں گجرات اسمبلی الیکشن کا اعلان ہوا اور ایک قریبی مقابلے میں مشینوں کی مدد سے بھارتیہ جنتا پارٹی گجرات میں اپنی حکومت بچانے میں کامیاب رہی۔ گو اس سے پہلے ملک بھر میں اسمبلی و پارلیمنٹ کی نشستوں کے لیے ضمنی انتخابات ہوئے اور ان میں بی جے پی کو کراری شکست ملی مگر یہ چھوٹی چھوٹی ناکامیاں اس کا زیادہ کچھ نہ بگاڑ سکیں۔

گجرات الیکشن کے بعد تری پورہ اور میگھالیہ میں تیسری پارٹی ہوتے ہوئے بی جے پی نے سرکار بنالی اور تادم تحریر کرناٹکا اسٹیٹ کے اسمبلی انتخابات کا بگل **ECI** نے بجایا ہے اور حکمران جماعت کے تمام ذمے دار الٹی سیدھے باتیں پھینکنے میں مصروف ہیں۔ رہا ملک تو، اس کی پہلے کب بنی تھی جو، اب بنتی، وہ مزید گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔

ملک کشاں کشاں عام انتخابات کی جانب بڑھنے لگا ہے تو حکمراں جماعت کے وزیر اعظم سے لے کر صدر تک ملک بھر میں لن ترانیاں کرنے لگے ہیں۔ ابھی سے **2018** سے ہی **2019** کا الیکشن جیتنے کے لیے میدان میں اترنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ پھر وہی پرانے راگ الاپے جا رہے ہیں اور وہی پرانی جملے بازیاں شروع ہو گئیں، وہی پرانے بھکت سر میں سر اور تال میں تال ملا کر ان الیکشن میں مقابلہ آرائی کی راہیں ہموار کر رہے ہیں۔ حالاں کہ جیسے کارنامے اس جماعت/ حکومت نے انجام دیے، اس کے بعد اخلاقی طور پر بھی اسے انتخابات میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ مگر اسے اس کی کوئی فکر تھوڑی ناہے! یہ اخلاق و مورل کیا جانیں؟ انھیں تو بس ستہ یعنی اقتدار چاہیے، چاہے وہ کسی بھی طرح پر ملے، لاشیں

www.urduchannel.in



گرا کر یا فسادات کرا کے، اسی طرح مشینوں کو یرغمال بنا کے انھیں اقتدار چاہیے، وہ ہڈیوں پر چل ہی کیوں نہ حاصل ہو.....

○○○

## (5)

### ذکر اس پری وَش کا.....——

نئی دہلی کے سینٹرل ایریے سے جب جنوب مغرب کی طرف آتے ہیں تو قدرتی اور مصنوعی پرفضا مقام پر، چاروں جانب سے ملٹی فلیکس مال، ملٹی اسٹوری بلڈنگس، انسٹی ٹیوشنل ایریاز کے درمیان گھنے جنگلوں میں ایک عظیم الشان یونیورسٹی قائم ہے۔ جس کا کیمپس قدرتی نعمتوں سے مالا مال اور دہلی کے سب سے اونچے پہاڑ پر واقع ہے۔ صبح ہوتے ہی یہاں کمروں کی کھڑکیوں پر خوش نوا چڑیائیں سونے والوں کو جگانے آجاتی ہیں اور جنگلوں میں مور پنکھ پھلا کر رقص کرتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے مشرقی حصوں سے سورج عمودی ہیئت میں بڑھتا جاتا ہے، اس کے تاریک شبستان بھی روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نصف النہار پر جب سورج کا قہر اور تیور سخت ہوجاتے ہیں، اس وقت ہاسٹلس کی چھتوں پر لگے جدید طرز کی سولر/سولار پلیٹس، اس کی حدت کو اپنے اندر جذب کرتی رہتی ہیں اور سردیوں میں گرم پانی کے ساتھ ساتھ ہیٹنگ کے کام ان سے لیے جاتے ہیں۔ جب آسمانوں کی بلندی سے کچھ نیچے آئیں تو یہاں کیکر، جامن، آم، اشوک، شیشم، نیم، پیپل، املی، کریل، کلوننگ پلانٹس اور پھول دار جھاڑیوں کے باغات میں شوخ رنگ طوطے، کوکتی کوئلیں، چہکارتے پرندے اور زمین پر کلیچیں بھرتی، دوڑتی نیل گائیں، جے این یو کی رونق بڑھاتی ہیں۔ جب سورج پشچم

www.urduchannel.in



آباد کی طرف جاتے جاتے سرخ ہوجاتا ہے، تب کیمپس کے آباد علاقوں میں اِدھر سے اُدھر بے فکر و بے خوف آتے جاتے لڑکے، لڑکیاں، نوعمر، متوسط عمر، ادھیڑ عمر اور عمر رسیدہ افراد، اپنے آپ میں ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک کلچر کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیر کو نکل پڑتے ہیں۔ پی۔ ایس۔ آر۔ رنگ روڈ، گنگا ڈھابہ، اسپورٹس اسٹیڈیم، کے۔ سی **OAT** لان، نرمدا اسٹیٹ زون یہاں کے خاص تفریحی مقامات ہیں۔ جے این یو کے پری پیکر و چاند چہروں کا ذکر الگ ہے جن کے روپ سے چاندنی بھی اپنی آب بڑھاتی ہے اور روشنیوں کو روپہلی چمک دمک ملتی ہے۔ کچھ چہرے تو ان میں ایسے ہوتے ہیں جو بے اختیار شدت سے اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ ان کے چلنے کی ادا اور اسٹیپ رائزنگ ایسی لگتی ہے جیسے ریت پر قدم چل رہے ہوں۔ ان کی چاندرخوں کی چارمنگ اور گلوئنگ، تو آنکھوں کی وضو اور دلوں کی نماز بنتی ہے۔ وہ چہرے جن پیکروں کا سرنامہ ہوتے ہیں، ان کا ذکر گردنوں سے شروع ہوکر ان کے بھرے بھرے جسم اور پورے سراپے تک جاتا ہے۔

ذکر جب چھڑا قیامت کا!
بات پہنچی تری جوانی تک!!

○○○

ہم نے دیکھا ہے شباب کا عالم !
شباب کا عالم، شراب کا عالم!!

جے این یو میں ہر موسم سب سے پہلے آتا ہے۔ سردی، گرمی، ساون وغیرہ سب سے پہلے جے این یو کو سلامی دیتے ہیں اس کے بعد دلّی کے دوسرے علاقوں میں ان کی خیراتیں تقسیم ہوتی ہیں۔ جب یہاں جسموں سے دھواں اٹھتا ہے، تب بادل برستے ہیں، پھر بے

خودی کا عالم نہ پوچھیے ۔ بادل بھی ان کی طلب اور احساس طلب، دیکھ کر ٹوٹ کر برستا ہے، وہ اپنے بھٹکے ہوئے کاروانوں کو بھی یہاں لے آتا ہے۔ یہ سب مل کر پھر فضاؤں کی تشنگی کا سامان کرتے ہیں۔ جب اس کا دامن نچڑ جاتا ہے تو وہ پر کیف وسحر آگیں ہوائیں بھیج دیتا ہے۔ جس سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

یہاں کے خوش پوش لڑکے لڑکیوں سے مارکیٹ میں آنے والا شاید ہی کوئی ذریس، فیشن یا ڈیزائن بچتا ہوگا۔ فلپ کارٹ اور ایموزون جیسی ملٹی شاپنگ سائٹس پر یہاں ہر دن سینکڑوں کی تعداد میں آرڈر بک کیے جاتے ہیں اور ڈیلیوریز ہوتی ہیں۔ اوبر، اولا کیب، جگنو آٹو، چنگ چی رکشہ سروسیز تو، یہاں کے مین گیٹ سے لے کر اندرون تک دستیاب ہیں۔ اس عیش ونشاط اور تن آسانی کے باوجود جے این یو اور یہاں کے اسٹوڈنٹ پوری دنیا میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے فرائض اور ذمے داریوں سے غافل نہیں ہیں۔ ان کا رزلٹ ہمیشہ امید افزا بلکہ اس سے سوا ہوتا ہے۔ علم، ذہانت، دانش مندی، نیشن بلڈنگ کے لیے اچھوتے اور نایاب آئیڈیاز یہاں ہر بچے کے ذہن میں موجود ہیں اور ان کے لیے یہاں خصوصی، لازمی ومتعدی تربیتیں ہوتی ہیں۔ یہاں کے ٹیچرس اور اسٹوڈنٹ اول دن سے ہی کشادہ ذہن وفکر کے مالک اور ایمانداری و نیک نیتی کے پاسبان ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے ہر سال قومی خدمت کے لیے سینکڑوں کی تعداد میں بیوروکریٹس، پروفیسر، ٹیچرس، آرکیٹیکچرس وغیرہ نکلتے ہیں اور جے این یو کے قیام کے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ تعصب، فرقہ یا گروہ پسندی سے بہت اوپر اٹھ کر قوم اور ملک کی خدمت کرتے ہیں۔

جے این یو میں ملک کا ہر تیوہار منایا جاتا ہے اسی طرح ہر قومی، سیاسی و مذہبی رہ نما کی

www.urduchannel.in



برسی، دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ ان کے شایان شان خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی کوششوں، خیالات، ونظریات کو سراہتے ہوئے انھیں زندگیوں میں شامل کرنے کے عہد لیے جاتے ہیں۔ یہاں کی ہاسٹل وکلچرل نائٹس میں علاقوں کی جھلکیاں تہذیبوں کی نمایندگی ہوتی ہے۔ یہاں کے ڈبیٹ کلچر میں ملک وبیرون ملک کے ہر برننگ ونان برننگ ایشو پر اوپن ہاؤس ڈسکشن ہوتا ہے۔ ہر ایک کو ان میں بولنے اور اظہار خیال کی آزادی ہوتی ہے۔ نتیجتاً ناکندہ تراش ذہن بھی بہت تھوڑے سے عرصے میں شعور آگہی حاصل کر لیتا ہے۔

اسی پری وَش کا ذکر ہے جو اس کمپوزٹ کلچر اور مذکورہ بالا خصوصیات اور خوبیوں کا مالک ہے—— اور پھر بیاں اپنا.....

.....وہی خوش حال وخوش فکر یونیورسٹی نہایت خوب صورتی اور سکون سے اپنی آگے کی راہیں طے کر رہی تھی۔ کہ اس کو دشمنوں کی نظر لگ گئی۔ اس کے گلشن پر سنگھ پریوار کا منحوس سایہ پڑ گیا۔ ممی ڈالا جگدیش کمار، اس منحوس سائے کا نام ہے جسے بحیثیت وائس چانسلر تعینات کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب جے این یو کا 'کل پتی' ایک غیر جینوائٹ بنا۔ ممی ڈالا نے وائس چانسلری کا عہدہ سنبھالتے ہی جے این یو کی بنیادوں، جے این یو کی قدروں، جے این یو کی امیج، جے این یو کے وقار، جے این یو کے وجود، جے این یو کے کلچر، جے این یو کی شناخت، جے این یو کے تصور جے این یو کے امتیاز سب کچھ کو خاک میں ملانا شروع کر دیا۔

**9** فروری **2016** کی تاریخ کو اس بربادی کی آغاز ہوا، جب جے این یو کے طلبا افضل گرو اور مقبول بٹ کے عدالتی قتل سمیت کشمیری مجاہدین کے تئیں سولوڈیٹری جذبات کے اظہار کے لیے جے این یو کے ایڈمنسٹریٹیو بلاک پر جمع ہوئے۔ جے این یو کی دائیں بازو کی تنظیم، اکھیل بھارتیہ ویارتھی پریشد **[ABVP]** کو ان کا اس طرح جمع ہونا ایک آنکھ نہ بھایا

لہٰذا اس کے کچھ شریر اور فسادی طلبا نے وہاں ملک مخالف نعرے لگانے شروع کر دیے:

**افضل ہم شرمندہ ہیں—**

**تیرے قاتل زندہ ہیں—**

**بھارت تیرے ٹکڑے ہوں گے—**

**ان شاء اللّٰہ ان شاء اللّٰہ—**

**یہ جنگ جاری رہے گی—**

**کشمیر تری آزادی تک—**

یہ نعرے **ABVP** کے فسادی طلبا اتنی صفائی سے لگا رہے تھے کہ کسی کو گمان بھی نہ گزرا کہ وہی ہیں اور سارا معاملہ جے این یو ایس یو اور ڈی ایس یو سے وابستہ طلبا پر آ گیا۔ قومی میڈیا فوراً حرکت میں آ گیا، اس دن اسی نیوز کو سب سے بڑی خبر بنا کر دکھایا گیا۔ زی نیوز کے سدھیر چودھری [جسے جے این یو کے طلبا سدھیر تہاڑی کہتے تھے] اور ٹائمس ناؤ کے سابق پروگرامر، ارنب گوسوامی [جسے جے این یو کے طلبا گوبر سوامی کہتے تھے] ممبئی کے پوش اسٹوڈیو سے اس مہم کو ہوا دینے میں پیش پیش تھے۔ منہ سے جھاگ نکالتی ان کی چیخوں نے جے این یو کو اپنی نفرت کی زبانوں پر رکھ کر اس کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ پورے ملک کو جے این یو کا دشمن بنا دیا۔ کیمپس میں پولیس آ گئی، یہ پہلا موقع تھا جب جے این یو جیسے پر امن اور ملک کے سرفہرست انسٹیٹیوٹ میں پولیس آئی تھی۔ خفیہ محکمے کے اہلکار سادہ لباس میں جے این یو کے ہاسٹل، پارکوں، کلاس رومس اور اسکولوں کو اس طرح سے چھاننے لگے جیسے یہ ایک دانش گاہ نہیں ملک دشمن عناصر کا ٹریننگ کیمپ ہو۔ ان سب کارروائیوں کے ساتھ ساتھ جے این یو کے طلبا و طالبات کی بدنامی، ان کی کردار کشی، ان کی وضع قطع، ان

www.urduchannel.in



کے رہن سہن، سب پر انگشت نمائیاں ہو رہی تھیں۔ ان سب باتوں کے سبب جے این یو کے طلبا اور اساتذہ بہت ہی عجیب اور تکلیف دہ کشیدگی کا سامنا کر رہے تھے۔

اس نعرے بازی اور پروگرام کے انعقاد کی پاداش میں جے این یو ایس کے سابق صدر بنیا کمار کو گرفتار کر لیا گیا اور دو تین طلبا انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ پورے ملک میں جے این یو کے خلاف نفرت کا ایک محاذ بن گیا۔ عالم یہ تھا کہ جے این یو کے طلبا اپنی شناخت چھپاتے پھرتے تھے۔ انھیں جینوائٹ ہونے کی بنیاد پر نہ تو کہیں کمرے ملتے اور نہ ہی کوئی سامان ملتا۔ کیمپس سے باہر نام نہاد دیش بھکت یہاں کے لڑکے لڑکیوں کو گالیاں بک رہے تھے۔ انھیں مارنے اور گھسیٹنے کا ''سنکلپ'' لے رہے تھے۔ ان کے کپڑے پھاڑنے اور ان کے نازک مقامات پر تیزاب اور ایسڈ ڈالنے کی قسمیں کھاتے تھے۔ کئی ایک نے تو قسم کھائی کہ اس وقت تک بیوی بچوں سے نہیں ملیں گے جب تک جے این یو کے کسی چھاتر، چھاترا کو نہ مار پیٹ دیں—— منیر کا اور جے این یو کے آس پاس کا ماحول پوری طرح گرم ہو چکا تھا۔ وہ کیسے دن تھے اور کیسی راتیں، سوچ سوچ کر اب بھی ہول آتا ہے۔

ان دنوں جے این یو کا اندرون، دلّی پولیس، میڈیا، فسطائی طاقتوں، جے این یو وی سی اور جے این یو کی بربادی کا خواب دیکھنے والوں کے خلاف احتجاجی مظاہروں اور لیکچر سیریز کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کے لیے جے این یو ایڈمنسٹریٹیو کے دامن میں واقع میدان کو ''فریڈم اسکوائر'' یا ''آزادی چوک'' کا نام دیا گیا اور اس کے سینے پر فیض احمد فیضؔ کا یہ مشہور مصرع لکھا گیا:

**بول کہ لب آزاد ہیں تیرے—**

**بول، اب تک زباں تیری ہے—**

اس کے علاوہ ان اکٹوئیٹیز کے لیے ایس ایل اولڈ [اسکول آف لینگویجز کی پرانی عمارت] کے لان کو بھی چنا گیا اور اس کا نام ''سوشل جسٹس اسکوائر'' رکھا گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ سوشل میڈیا پر جے این یو کے لیے حمایت کی غرض سے ٹویٹر ہینڈل پر ''**#اسٹینڈ وتھ جے این یو**''، ''**#فائٹ فار جے این یو**''، ''**#جگو وی سی واپس جاؤ**'' کے ہیش ٹیگس۔ فیس بک پر ''جے این یو وائس''، ''جے این یو واچ''، ''بول کے لب آزاد ہیں''، ''جے این یو کلب پرائم'' کے نام سے پیجز جاری ہو گئے۔ جن کی ملک بھر سے پذیرائی ہوئی اور خاطر خواہ سپورٹ ملا۔ شاید یہ اس احسان کا صلہ تھا جو جے این یو پورے ملک پر اس کے درد کو اپنا درد سمجھتے ہوئے اس کے لیے آواز اٹھا کر کرتا رہا ہے اور مظلوموں کی فریاد رسی کو اس نے اپنا فرض مانا ہے۔ جے این یو کی مصیبت کے دنوں میں ملنے والا اسے عوامی سپورٹ وہی تھا جو اس نے ملک کو دیا تھا اور بار بار اس کی گرتی ساکھ کو بچایا ہے۔

جے این یو کے پنک پیلس، یعنی ایڈمن بلاک کے ''فریڈم اسکوائر'' اور ''سوشل جسٹس اسکوائر'' میں چلنے والی ''لیکچر سیریز'' کے دوران ملک و بیرون ملک سے ماہرین سیاسیات، ماہرین تعلیم اور معاشیات یہاں آتے اور تین چار گھنٹے اپنے مکمل غم و غصے کے ساتھ طلبا کے ساتھ کھڑے رہتے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور اس مصیبت کی گھڑی میں طلبا کو ان حالات سے مقابل ہونے کے طریقے بتاتے اور ان کی دل جوئی بھی کرتے۔ ان اسپیچ اور لیکچرس کی فوراً ہی ویڈیو گرافی ہوتی اور اسے یوٹیوب سمیت سوشل میڈیا پر ڈال دیا جاتا اور پھر اس کی وونگ، لائکنگ کی ریٹنگ بڑھنے لگتی جو دوسرے دن **بلین+** بن جاتیں۔

''آزادی چوک'' کے علاوہ ''سابرمتی گراؤنڈ''، ''گنگا ڈھابہ''، ''اسکولس ایریا'' بھی طلبا کے احتجاج اور جے این یو وی سی و انتظامیہ کے خلاف غم غصے کے دوسرے مراکز بن گئے

www.urduchannel.in



تھے۔ جے این یو کی دیواریں تو تہرے تہرے لیئر سے پوتی گئیں ان پر ملک کو برباد کرنے والی طاقتوں، اے بی وی پی، جے این یو وی سی، قومی میڈیا اور جے این یو کو برباد کرنے والی ہر کوشش و مہم کے خلاف سلوگنس اور نعرے چسپاں کیے گئے۔

طلبا کی رات دن کی یہ اجتماعی کوششیں رنگ لائیں اور چھے مہینے بعد جے این یو ایس کے صدر بنیا کمار تہاڑ جیل سے ضمانت پر رہا ہو کر جے این یو لوٹے تو ان کا استقبال کسی بادشاہ کی طرح ہوا تھا۔ تمام رات طلبا خوشی اور بے خودی میں ناچے تھے۔ احساس مسرت سے ان کے سینے پھٹے جا رہے تھے، وہ رات پورے جے این یو میں کسی بہت بڑے جشن کے طور پر منائی گئی۔ لڑکیوں نے عالم تصور میں اپنی پلکیں بچھا دی تھیں۔ بنیا کمار آئے اور آتے ہی لال سلام اور جے این یو کے روایتی نعروں کے فلک شگاف سروں کے درمیان جب انھوں نے ''آزادی'' ترانہ شروع کیا تو تمام طلبا ان کے سُر میں سُر میں اور تال میں تال ملانے لگے:

**ہم کیا چاہتے، آزادی—**

**غریبی سے، آزادی—**

**بھکمری سے، آزادی—**

**ذاتی واد سے، آزادی—**

**پونجی وادسے، آزادی—**

**برھمن وادسے، آزادی—**

**آر ایس ایس سے، آزادی—**

**سنگھ واد سے، آزادی—**

**ہم لے کر رہیں گے، آزادی—**

**ھے حق ھمارا ،آزادی—**

**جو تم نہ دو گے ،آزادی—**

**ھم لڑ کر لیں گے ،آزادی—**

**ھم چھین کے لیں گے ، آزادی—**

**آزادی ،آزادی ،آزادی،، آزادی—**

یہ ترانہ جے این یو کی اس رات کے بعد پورے ملک میں گونجنے لگا۔سنگرز اور گلوکاروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ملٹی پلیکس اسٹوڈیوز میں میوزک وانسٹرومنٹس کی نئی و پاپولر دھنوں سے اسے سجانے لگے۔یوٹیوب چینل پر اس ترانے کے متعدد ورژنوں کو **ملینز +** اور **بلینز +** لائکس ،سبسکرائبیشن اور وویونگس ملنے لگے۔چنانچہ یوٹیوب پر آج بھی انھیں سنا جاتا ہے اور سننے والے سر دھنتے ہیں۔

اس کے بعد جے این یو میں پریس کانفرنسوں کا دور چلا جس میں انفرادی طور پر جے این یو ایس یو کے آفس بیئرر اور عام طلبا حصہ لینے لگے۔تین مہینے بعد دلّی ہائی کورٹ کا فیصلہ بنیا کمار اور طلبا کے حق میں آیا اور دلّی پولیس سمیت جے این یو انتظامیہ کی سخت الفاظ میں سرزنش کی گئی۔

طلبا مختلف ٹولیوں میں **''جگو وی۔سی مردہ باد....آر ایس ایس،مردہ باد.....جگو رام واپس جاؤ،واپس جاؤ،واپس جاؤ''** کے نعرے لگاتے تھے۔یہ وہ نعرے تھے جو ان دنوں جے این یو کی فضاؤں میں بہت شدت سے گونجتے تھے۔لڑکے لڑکیوں کے ملے جلے سُر فضا میں دل کش نغمگی سی بکھیر دیتے مگر وہ فضا ان کے درد کا احساس نہ کر پاتی تھی ،اسے تو نسائیت کا احساس ہی خشمگیں کر دیتا تھا۔ پاگل فضا ان سرفروش طلبا کے اندرونی کرب کو جاننے کے

www.urduchannel.in



بجائے ان کے گلاب چہروں،غزال آنکھوں،سلکی بالوں اور ادھ کھلے جسموں سے لطف اندوز ہوتی تھی۔

طلبا کی ان مہمات سے جے این یو وی سی کے خطرناک ارادوں پر کچھ وقت کے لیے بندش لگی مگر وہ موقع کی تلاش میں رہے۔چنانچہ جیسے ہی موقع ملا،ان کی فسادی طبیعت نے جے این یو کی آزادی کو جکڑنا شروع کر دیا۔سب سے پہلی چوٹ تعمیر جے این یو پر یو جی سی کی جانب سے فرضی سیٹ کٹ کے فارمولے کے پرپوزل،پھر نوٹیفکیشن اور آخر میں حتمی طور پر فرمان جاری کر کے ماری گئی۔طلبا یہ دیکھ کر سراپا احتجاج بن گئے۔تاہم اس مرتبہ چالاک اور ہوشیار وی۔سی نے وہ چالیں نہیں چلیں جن سے انھیں کسی دارالاحتساب میں گھسیٹا جاتا۔ اس مرتبہ اس نے اوپن ہاؤس ریفرنڈم کرایا۔طریقۂ کار اتنا پرفریب تھا کہ طلبا اور اساتذہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔یو جی سی کا حوالہ دیکھ کر **JNUSU** اور **JNUTA** کا ایک گروہ سیٹ کٹ کا حامی بن گیا تھا تو دوسرا مخالف۔طلبا اور اساتذہ کے دونوں گروہوں کو آپس میں لڑا کر وی سی مہاراج جے این یو کے جنگلوں میں واقع اپنے کوارٹر میں چین کی بانسری بجا رہا تھا۔

○○○

اس دن نوین ہنس رہا تھا مگر اس کی ہنسی میں مایوسی اور اداسی مجھے صاف دکھ رہی تھی۔میں نے اس سے کہا:

''—— کیوں بے ڈوڈ! کیا ہوا،دانت کیوں دکھا رہے ہو،خیریت تو ہے؟''

میرے اس سوال کو نظر انداز کر کے وہ پاگل ہنستا ہی رہا۔

''—— ہت تیری کی.....کیا ہوا بھائی کچھ تو بتاؤ،ویسے مجھے تمھاری ہنسی میں خوشی نہیں، اداسی دکھ رہی ہے——''

اچانک نوین کی ہنسی پر بریک لگے اور اس کی آنکھوں کے تیور بدل گئے۔

''—— پتا ہے انیس! جے این یو اب اپنے پرانے دنوں کو روئے گا۔اب اس کا وہ زمانہ لد گیا جسے یہ اپنا اچھا زمانہ کہتا تھا، اب یہاں آر ایس ایس کی شاکھائیں کھلیں گے اور تعلیم کے بجائے ''وندماترم'' کے نعرے لگیں گے ------.ابھی الیکشن ہوں گے جسے ABVP جیتے گا اور وی سی اسے سپورٹ کرے گا اور پھر جے این یو.....''

یہ کہہ کر وہ پھر ہنس پڑا اور میں اس کی ان فلسفیانہ باتوں کو سن کر سر کھجاتا رہ گیا۔میں حیران تھا کے وہ آج کیا کہہ رہا تھا۔حالاں کہ وہ گزشتہ دو سال سے میرا روم میٹ تھا، میں نے تو اسے ہمیشہ گم صم گم صم کتابوں میں کھویا دیکھا تھا۔وہ تو کسی ریلی اور پروٹیسٹ میں بھی آج تک گیا بھی نہیں تھا۔مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ باتیں مجھے بھی محسوس ہو رہی تھیں۔بلکہ مجھ سمیت جے این یو کا ہر حساس طالب علم اسی طرح کے احساسات اور افکار سے دوچار تھا۔ بس اسے اظہار کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

جے این یو میں 17-2016 یونین الیکشن کا ماحول گرم ہو گیا۔اول دن سے ہی لیفٹ کی سب سے بڑی پارٹی ''آئیسا'' کی طاقت کمزور پڑتی دکھ رہی تھی اور ABVP اپنا قد بڑھاتی جاری تھی۔مگر رولنگ آئیسا اس کے باوجود بھی کسی بھی آرگنائزیشن سے اتحاد کی حامی نہیں تھی۔نوین جیسے طلبا جے این یو کی اسی بربادی کا ذکر اور احساس کر رہے تھے۔مغرور ''آئیسا'' کسی چمتکار کی منتظر تھی کہ ایک دن اسے یہ حقیقت محسوس ہی ہو گئی اور اس نے عین الیکشن سے دس دن پہلے SFI سے اتحاد کر لیا۔ABVP اور تیسرے فرنٹ BAPSA نے اسے للو، چنو کی جوڑی کہا۔مگر اس للو اور چنو، کی جوڑی نے دس دن میں اتنی محنت کی کہ جب 15 ستمبر 2016 کو یونین الیکشن کے رزلٹ آئے تو AISA اور SFI جیت کا جشن منا رہے تھے۔

www.urduchannel.in



''—— لو نوین جی! لیفٹ جیت گیا اور برہمن واد کا منہ کالا ہو گیا....!''اس دن میں نے کمرے پر آتے ہی نوین کو انگوٹھے دکھاتے ہوئے کہا۔اس کے جواب میں اس نے میرے آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتے ہوئے جوابی ٹھینگے دکھاتے ہوئے کہا:

''انیس! میں پھر وہی بات کہوں گا جو اب سے ایک مہینہ پہلے کہی تھی، جے این یو کو اب گھن لگ چکا ہے، کسی بدنظر کی بہت بری نظر لگ گئی اور اب یہ تیزی سے بربادی کی طرف بڑھ رہا ہے، اسے کوئی نہیں روک سکتا۔اس مرتبہ لیفٹ کو یہ جیت بہت مشکل اور مہنگی پڑے گی۔انیس پتا نہیں کیوں بار بار مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے۔تم مانو یہ نا مانو——۔''

اور مجھے اس کی باتوں سے اتفاق کرتے ہی بنا، کیوں کہ لیفٹ جس طرح جیت کا جشن منا رہا تھا اس جیت کی خوشی میں اس کی چہرے اور وجود کی شکست کا اندازہ بہ خوبی ہو رہا تھا۔اس کی شکست اس کے چہرے اور وجود پر کڑک رہی تھی۔

ooo

جے این یو کے باہر ملک ان دنوں عجیب سی کشمکش اور اضطراب سے گزر رہا تھا۔ایک طرف مرکزی حکومت کے ملک گیری کے ایکسپریمنٹ ناکام ہو رہے تھے، دوسری طرف گائے، گاؤ اور بیف کے نام پر ماب لنچنگ کے واقعات تیزی سے بڑھ رہے تھے، دادری کے اخلاق، امروہہ کے محمد ناصر، جھارکھنڈ کے نسیم انصاری، الور کے پہلو خان، جے پور میں کانپور کے فیصل کا قتل اور بلبھ گڑھ میں حافظ محمد جنید کے بہیمانہ قتل۔یہ سب وہ واقعات تھے جو بیف اور ''گئو رکھشا'' کے نام پر ملک بھر میں برپا کیے گئے اور انھوں نے ملک کی کمر توڑ دی۔ماب لنچنگ کا طریقۂ کار بھی ایسا تھا کہ قاتل کی نہ کوئی شناخت اور نہ کوئی اتا پتا اور مقتول کی لاش خون میں لت پت پولیس کے ہاتھ لگتی۔شر پسندوں کا ایک ہجوم کہیں بھی جمع

ہوتا اور گائے، یا گوشت لے جاتے کسی بھی مسلمان پر، پل پڑتا، پھر اس غریب کی جان لے کر ہی ہٹتا--------اور پولیس لکیر پیٹتی رہ جاتی۔ **2014** سے اب تک اس قسم کے **130** واقعات سرکاری ریکارڈ میں درج کیے گئے۔

ایک طرف ملک ماب لنچنگ کی بھینٹ چڑھ رہا تھا، دوسری طرف جے این یو **ABVP** کولیفٹ کی حالیہ جیت بالکل راس نہ آئی۔ ان دونوں واقعات میں گہری مناسبت تھی۔ جس کی یکسانیت ومناسبت اس وقت سامنے آئی جب جے این یو میں بھی ماب لنچنگ کی ایک خوفناک واردات ہوئی۔ جس کے تصور سے آج بھی روح کانپ جاتی ہے۔

اسٹوڈنٹ یونین میں **ABVP** کی جیت کا خواب اس کی آنکھوں میں کسی شیشے کی طرح ٹوٹ چکا تھا۔ لہٰذا اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے اس نے طویل فکری اسٹریٹجی بنانی شروع کردی۔ جس طرح اس کی مدر آرگنائزیشن یعنی آر ایس ایس بناتی ہے اور انھیں ملک کے طول وعرض میں آزماتی ہے۔ اس کا ایک تجربہ اس نے **2005** سے **2012** کے درمیان ملک بھر میں سیریل بم بلاسٹ کر کے کیا تھا۔ یہ سب اتنی صفائی سے کیا گیا کہ پولیس اور انتظامیہ لکیر پیٹتی ہی رہ گئی۔ جو دو چار پکڑے بھی گئے وہ ضمانتوں پر رہا ہو کر پھر سے ملک میں آگ وخون کا کھیل کھیلنے کے لیے منصوبہ بندی کر رہے ہیں نیز ان کے اعترافی اور اقبالیہ بیانات کو غائب کیا جا رہا ہے، ان کی کالی کرتوتوں کے ثبوت مٹائے جا رہے ہیں اور جس کے بعد یہ تو حتمی بات ہے کہ انھیں دیش کے سب سے بڑے اور خالص بھکت کا سرٹیفکیٹ بھی دے دیا جائے گا۔ بسیما نند، سادھوی برگیہ سنگھ، بجرنگی سارنگ، وغیرہ ایسے کتنے ہی نام ہیں جو ہر انصاف پسند ہندوستانی کی ہائی لسٹ پر ہیں۔

○○○

www.urduchannel.in



جے این یو کے پشچم آباد زون کے ایک بڑے ہاسٹل کے کمرے میں خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی۔ یہ جے این یو **ABVP** کے ایکٹویسٹ تھے۔

''سالا! ہماری ساری کوششیں فیل ہوگئیں، ابے یار، یہ کیسے ہوگیا-------- پتا ہے شاکھا سے سنچالک مہودے نے فون پر بہت بری بری گالیاں دی ہیں اور'' کلاس لگانے'' کی دھمکی دی ہے۔...سالا دماغ خراب کر دیا۔ ارے ہم کیا کرتے، کتنی کوشش تو کی تھی نا ہم نے، اوپر سے مہودے کل پتی جی نے بھی فون کر کے برا بھلا کہا ہے۔'' اس میٹنگ کا صدر بول رہا تھا۔

''——— اوہ جسٹ شٹ اپ یار! کب تک روئیں گے، اب کچھ کرنا ہی ہوگا۔'' ایک ایکٹویسٹ بولا۔

''——— کیا کرنا ہے بے'' ایک تیسری آواز اس گہری خاموشی میں ابھری۔

''——— میرے پاس ایک مست پلان ہے، پلان **D**۔ سب کان لاؤ ادھر——— ''

چوتھا ایکٹویسٹ بولا اور پھر پلان **D** کے اپلی منٹ کے لیے کھسر پھسر شروع ہوگئی۔

وہ کھسر پھسر کیا تھی، اس کا پتا جے این یو کے طلبا کو آنے والے دنوں میں چلا۔ **ABVP** کا پلان **D** یہ تھا کہ آنے والے ہوسٹل پرسیڈینشئیل الیکشن کی کمپینگ کے دوران کسی مسلم اسٹوڈنٹ کو ٹارگٹ کرنا ہے۔ اس پر سختی سے نظر رکھنی ہے، اسے الیکشن ونگ کا ایشو بنانا ہے۔ یاد رہے کہ وہ بالکل نیا بھی ہو، یہ ٹارگیٹنگ، کلنگ میں بدلنی ہے اور اس کے لیے طریقہ وہی، جو ہمارے بندے جے این یو سے باہر ملک بھر میں اختیار کر رہے ہیں۔ یعنی ہجومی تشدد کے ذریعے بندے کو ختم کرنا۔ وغیرہ

جن دنوں ہاسٹل میں الیکشن کمپین چل رہی تھی اور صدارتی امیدواروں کے کارکن ڈور ٹو ڈور جا کر ووٹ مانگ رہے تھے، ان ہی دنوں ان دشمنوں کی نگاہوں نے ایک معصوم کو تاڑ لیا۔

وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بائیوٹیکنیک میں گریجویشن کر کے ماسٹرس کے لیے جے این یو آنے والا ایک بندہ تھا، جسے ابھی کیمپس میں آئے ہوئے پندرہ، بیس روز ہی ہوئے تھے۔ اس کا نام محمد نجیب، جے این یو کے بچے بچے کے سینے میں درج ہے۔ وہی مظلوم **ABVP** کے ان فسادیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ ایک چلتا پھرتا وجود، کہانی بن گیا، ایک افسانہ بن گیا، وہی نام، گم نام ہو گیا۔ ایسا گم نام ہوا کہ اسے آج تک دلّی پولیس، کرائم برانچ، یہاں تک کہ سی بی آئی بھی نہ ڈھونڈ سکی، جسے سمندر کے پاتال سے سوئی نکال لانے کا بھی دعوا ہے۔

**14** اکتوبر **2016** کی شام اس غریب پر بہت گراں گزری، اس دن **ABVP** کے کارکنان نے اس پر قیامت ہی توڑ دی۔ اس زیادتی کے روا رکھنے کے لیے انھوں نے ایک بہانہ بھی تراش لیا کہ وہ ایک ایکٹویسٹ کی کلائی (**Wrist**) میں بندھے ''لال کلاوے'' پر لاف وگزاف کر رہا تھا، اسے جہنم اور خدا کی مار کی نشانی بتا رہا تھا۔ یہ ہماری آستھا سے جڑی چیزیں ہیں، ان پر ہم کسی کے منہ سے کچھ نہیں سن سکتے، وغیرہ۔ ان باتوں میں حالاں کہ کوئی سچائی نہیں تھی، یا تھی بھی، خدا بہتر جانتا ہے۔ تاہم جے این یو کے طلبا اتنا جانتے ہیں کہ اتر پردیش کے چھوٹے سے شہر، بدایوں سے تعلق رکھنے والے نجیب پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کے بعد شام کے بعد آنے والی سیاہ رات اس غریب نے آہوں اور کراہوں میں گزاری، دن کا سورج طلوع ہوا اور پھر اسی دن 12 بجے اسے اغوا کر کے خدا جانے کہاں لے جایا گیا، جس کا آج تک بھی پتا نہیں ہے۔ دلّی پولیس، سی بی آئی، دلّی سرکار، مرکزی حکومت، کوئی بھی اسے آج تک ڈھونڈ نہ سکا۔

**ABVP** کے ایکٹویسٹ اس دن بہت خوش تھے، جیسے انھوں نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ انھوں نے ہاسٹل کے گیسٹ روم کے ٹیبل پر چاک سے لکھا تھا:

**''ہم نے نجیب کو ستر حوروں کے پاس پھنچا دیا''**

www.urduchannel.in



.....

**''All Muslims are Terrorist''**

وہ ٹیبل آج بھی دلّی پولیس کے فورنیسک ڈیپارٹمنٹ میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگی۔

جے این یو کے صبح وشام، یہ قیامتیں دیکھ رہے تھے اور خون کے آنسو رو رہے تھے۔

○○○

نجیب احمد پر گزری قیامت کی خبر سن کر اس بدنصیب کی ماں ''نفیس فاطمہ''۔ بیمار بھائی اور کزن سسٹر ''صدف''، روتے پیٹتے آئے اور کیمپس کا روم روم، چپہ چپہ، کونا کونا چھان مارا۔ نجیب کی خون آلود ٹوٹی چپل ان کے ہاتھ میں تھی جو انھیں ہاسٹل کی لان میں پڑی ملی تھی۔ اس دن شام کو جے این یو ایس یو آفس میں محمد نجیب کے ساتھ بیتی ''اَن ہونی'' پر کینڈل برننگ کی گئی اور رات کو جے این یو کے **YFDA** سے جڑے مسلم طلبا اور دیگر نے جے این یو کا مین گیٹ بلاک کر دیا۔ جسے چار گھنٹوں بعد، پروکٹر کی یقین دہانی کے بعد ہی کھولا گیا۔

دوسرے دن پورے کیمپس کا عجیب حال تھا۔ یہاں نجیب کو لے کر الگ الگ باتیں ہو رہی تھیں، خود اپنے تئیں بھی کچھ اندیشے اور ان سے بچنے کی فکریں۔ طلبا میں دھیرے دھیرے بے نام سا خوف ہراس پھیل رہا تھا۔ نفیس فاطمہ اور صدف نجیب کو اس طرح ڈھونڈ رہے تھے جیسے بدنصیب سارس کے جوڑے کا بچہ جنگل میں کہیں کھو جائے اور وہ اسے دلخراش آوازیں دیتے پھرتے ہیں۔

نوین آج پھر ہنس رہا تھا۔

''——— دیکھا انیس! میں نہ کہتا تھا۔ جے این یو اپنی بربادیوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نجیب پر زیادتی اور اس کی گمشدگی اس کی سب سے بڑی نشانی ہے یا جے این یو کی مصیبتوں کا آغاز کہو۔''

''—— تم سچ کہتے ہو یار نوین....آج جانے کیوں تیری باتوں پر یقین کرنے کو دل کرتا ہے۔''

مجھ سے اس کے سوا کچھ نہ کہا گیا کیوں کہ ایک انجانے خوف نے مجھے پسلیوں کے قریب سے جکڑ لیا۔جن کی سختی بڑھتی ہی جارہی تھی ۔کتنے ہی الفاظ،احساسات،خیالات میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔

''—— مجھے سب سے زیادہ حیرت تو اس بات پر ہے،اور پھر حیرت بھی رہنے دو،کہ ہاسٹل کے وارڈن،ہاسٹل کی سکیورٹی،ہاسٹل کے سامنے سے گزرنے والے کسی بھی شخص کو یہ نہ پتا چل سکا کہ کسی کو اغوا کیا جارہا ہے....'' نوین ماتھے پر ہاتھ مار مار کر کہہ رہا تھا۔

''—— نوین جی!تم ان سنگھیوں کو نہیں جانتے،ان کی چالاکیوں سے لگتا ہے تم واقف نہیں ہو،سنگھیت ایک ایسا زہر ہے جو ایک چھوٹے سے بچے سے لے کر عام آدمی تک اور عام آدمی سے لے کر ذمے دار افسر و پروفیسر تک میں سرایت کیا ہوا ہے۔اگر تم نہیں جانتے تو ''آج تک''ٹی وی کی ''سنگھم سیریز'' دیکھو۔ممکن ہے محمد نجیب کا اغوا،وارڈن اور سکیورٹی کے سامنے ہوا ہو۔''میں نے کہا۔جس کے جواب میں نوین سر ہلا کر رہ گیا۔

''—— تم کیا سمجھتے ہو،میں ان باتوں کو نہیں جانتا!کیا میں نے ''سنگھم سیریز'' نہیں دیکھی ہوگی،مگر مجھے اس قسم کا خدشہ نہیں تھا——'' نوین کے لہجے میں اعتماد آتے آتے پھر حسرت میں تبدیل ہوگیا۔

''—— تمھیں پتا ہے،ہمارے علاقے میں بھی ایک شاکھا ہے۔ہمیں بچپن میں اسکول کی طرف سے ایک مرتبہ وہاں لے جایا گیا تھا،وہاں کی سبھا میں سنچالک اور پرچارکوں نے جو کہا،میں آج تک نہیں بھولا ہوں....'' نوین کہنے لگا اور میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''—— وہ کہہ رہا تھا:''بھارت ماتا نے سارے لوگوں میں سے ہمیں اپنی سیوا اور بھکتی

www.urduchannel.in



کے لیے چنا ہے۔رام مندر ہمارا مولک ادھیکار ہے،جسے اب ہم بنانے کا سنکلپ لیتے ہیں،اسے ہم بنا کر ہی رہیں گے،ہم بھگوان کا وردان ہیں جنھیں بھارت ماتا کی رکشا کے لیے بھیجا گیا ہے۔بھکت گن!اس دیش کے غدار مسلمانوں نے بھارت ورش کے ٹکڑے کردیے،جس سے شیروں والی بھارت ماتا کا شریر اور انگ ٹوٹ گیا۔وہ کیسے کراہ رہی ہے، ذرا کان لگا کر تو سنو!وہ کیسے پکار رہی ہے،اس کی پکار تو سنو!ماتا اپنے بچوں کے سامنے رو رہی ہے،ان کے سامنے بلک رہی ہے اور ان سے منتیں کررہی ہے۔اب وقت آگیا ہے کہ ہم بھی ان غداروں کے ٹکڑے ٹکڑے کریں۔انھیں بھی ایسے ہی تڑپائیں جیسے انھوں نے ماتا کو تڑپایا ہے۔ان سے ماتا کی ایک ایک سسکی،ایک ایک کراہ اور ایک ایک آنسو کا بدلہ لیا جائے۔اب وقت آگیا ہے کہ ان کی گھنی آبادیوں میں آگ لگا دیں۔ان کے گھروں میں بیٹھی ان کی ناریوں کے کپڑے اتار دیں۔ان کو پاکستان کے قبرستانوں میں ٹھونس دیا جائے اور ان کا وجود مٹا کر بھارت ماتا کو شانتی پردان کی جائے۔'' سبھا پتی کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر کچھ دھاری ہاتھوں میں تلوار،بلّم اور بھالے لہراتے ہوئے،وندے وندے ماترم، وندے وندے ماترم،بھارت ماتا کی جے جے—— کے نعرے لگا رہے تھے۔''

نوین نے کسی شاکھا میں چلنے والی سبھا کا حال اس طرح سنایا کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ اس کا انداز ہ ایسا ہی تھا جیسے وہ لائیو کاسٹ کررہا ہو۔اس کی گہری اور کھوئی آنکھیں میرے سینے میں پیوست ہورہی تھیں

''—— اوہ مائی گوڈ!''

میرے منہ سے بہ مشکل نکلا۔میں پسینہ پسینہ ہوگیا۔سسکیاں میرے وجود سے پھوٹ رہی تھیں۔میں نے کسی دوشیزہ کی مانند ایک ہاتھ منہ پر اور دوسرا ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔میری یہ حالت دیکھ کر نوین ہنس رہا تھا۔اس کی ہنسی مجھے زہر خند لگ رہی تھی۔

○○○

## (6)

### سہمی سہمی ہے فضائے جے این یو ——

محمد نجیب کی گمشدگی اور اس پر گزری ہولناکیوں کے واقعات نے ایک بار پھر جے این یو کیمپس میں ارتعاش برپا کر دیا۔ یہ ارتعاش اور بے چینی، 8 فروری کے واقعات سے بھی زیادہ شدید تھی۔ اس واقعے کی گونج بھی پورے ملک میں اسی طرح سنائی دی۔ جس کے بعد پورا ملک جے این یو کے تئیں فکر مند ہو گیا اور جے این یو کے اندرون کی فضائیں، احتجاج، پروٹیسٹ اور فسطائیت، آر ایس ایس، ABVP کے خلاف نعروں وغم وغصے کے زور سے بج اٹھیں۔ آزادی چوک پھر سے سج گیا اور ہر شام احتجاجی طلبا، جے این یو ٹی اے، جے این یو ایس یو و دیگر طلبا تنظیموں کے بینر تلے جمع ہوتے اور روایتی نعروں واحتجاج کے طریقوں کے بعد محمد نجیب کی حمایت میں کسی نکڑ ناٹک دیکھتے یا لیکچر سنتے۔

جے این یو کی دیواروں پر محمد نجیب کی تصویریں چسپاں تھیں جن کے نیچے تلاش گمشدہ کی اطلاع دینے کے بدلے، رقم ہزاروں سے لے کر لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ ہم طلبا گزرتے ہوئے انھیں دیکھتے تو ان کا خوف اور بڑھ جاتا۔ ہمیں ایسا لگتا کہ جے این یو کے کسی اندھیرے موڑ سے دو ہاتھ نکلیں گے، ایک ہمارے منہ پر ہوگا اور دوسرا کمر کو حمائل کرتا ہوا، پھر یہ دونوں ہاتھ ہمیں بورے میں بھر دیں گے، اس کے بعد پتا نہیں ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ہم

www.urduchannel.in



جانے پہچانے اور شناسا راستوں میں دو قدم چلتے، پھر پیچھے مڑ کر دیکھتے، پھر چلتے۔ منٹوں کے راستے کاٹنے بھی ہمیں بھاری پڑ جاتے تھے۔

ایک طرف یہ صورت حال تھی اور دوسری طرف نیشنل میڈیا دلّی پولیس کے اشاروں پر روز نئی نئی بریکنگ نیوز چلا رہا تھا: ''محمد نجیب پاگل تھا، اسے بات بات پر غصہ آتا تھا۔ وہ کسی پر بھی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا تھا۔'' کبھی وہ کہتا: ''آج محمد نجیب کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دیکھا گیا۔'' کبھی کہتا: ''آج نجیب کیرلا میں دیکھا گیا، ایک ویڈیو بھی سوشل میڈیا پر ایڈٹ کر کے ڈال دی گئی۔ جو تیزی سے وائرل ہو رہی تھی۔ اس میں نجیب کی ڈب کی ہوئی آواز کہہ رہی تھی:

''—— میرا نام نجیب ہے، میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں، مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں ہندوؤں کو جہنم رسید کر دوں، ان سے ایک ایک کرنی کا بدلہ لوں گا۔ بابری مسجد، مالیگاؤں، حیدرآباد، اجمیر درگاہ، بٹلہ ہاؤس، میں سب کا بدلہ لوں۔ اپنی آخری سانس تک ان ہندوؤں کو نہیں بخشوں گا——''

....کبھی یہی میڈیا نجیب کے تار ''ISIS'' سے جوڑ دیتا تو کبھی کالعدم تنظیم ''SIMI'' سے اس کی لنکنگ کر دیتا۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر محمد نجیب غائب کا غائب، اس کا کوئی سراغ نہیں، اس کا کوئی اتا پتا نہیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ حکومتی اور انتظامی سطح پر اس کی تلاش میں کوئی بھی دل چسپی اور مستعدی نہیں دکھا رہا تھا۔

سیاسی پارٹیاں اور سیاسی شاعر، مشاعروں اور جلسوں میں نجیب کا نام اچھال اچھال کر عوامی حمایت اور مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ ہر محفل اور ہر جلسے میں بات نجیب سے ہی شروع ہوتی اور نجیب پر ہی ختم ہو جاتی۔ اس دوران میں ''ذکر نجیب'' کرنے والوں کی تمام مرادیں پوری ہوتیں اور مقاصد حاصل ہو جاتے، مگر نجیب اسی طرح غائب رہتا، نجیب اسی

طرح لا پتہ رہتا، نجیب اسی طرح گمشدہ رہتا۔نفیس فاطمہ اسی طرح صدف کے گلے میں ہاتھ اور شانوں پر منہ ڈال کر روتی رہتیں، آسمان والا اپنی زمین و آسمانوں پر محیط کرسی پر بیٹھا دیکھتا رہتا۔اس کا ہاتھ پتا نہیں جس جماعت کے اوپر تھا.....

○○○

جے این یو کے باہر تو یہ سب کچھ چل رہا تھا اور اندرون میں جے این یو ایس یو کی فرقہ پرستانہ سوچ کا خول اتر رہا تھا۔ اسی طرح **BAPSA** بھی نجیب کے ساتھ ہوئی زیادتی میں ملوث ایک ''دلت'' **ABVP** ایکٹویسٹ کی وجہ سے اس مومنٹ میں پھوٹ ڈالنے لگا۔ **JNUSU** اور **BAPSA** نے باہر کے سیاست دانوں کے طرز پر اس موقع سے سیاسی فائدہ بھی اٹھانا چاہا، اسی طرح رائٹ ونگ کی حمایت کے حصول کی شرمناک کوشش بھی کی مگر وہ اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ان دونوں نے ایک سلوگن دیا کہ ''نجیب کو مسلمان کی حیثیت سے نہیں، جینوائٹ کی حیثیت سے دیکھا جائے۔'' اس طرح سے رائٹ ونگ کی مسلم دشمنی کا ایک طرح سے دفاع ہوتا تھا۔اس لیے جے این یو کا بچہ بچہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ محمد نجیب کے ساتھ زیادتی مسلم نام، مسلم شناخت اور مسلم آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ہوئی اور مار پیٹ کرنے والے **ABVP** کے ارکان، اسی فسطائی سوچ کے مطابق ہی یہ سب کر رہے تھے جو ان کی مدر آرگنائزیشن، **RSS** اور **BJP** کرتی رہی ہیں۔ وہ کہہ بھی رہے تھے کہ ہم نے نجیب کو ''ستّر حوروں'' کے پاس پہنچا دیا اور سب مسلمان دہشت گرد ہیں۔ اگر ایسا نہیں تھا اور نجیب کو جینوائٹ کی حیثیت سے دیکھا جانا چاہیے تو پھر ان مذکورہ باتوں کا کیا مطلب تھا۔اور پھر ایسا بھی نہیں یہ باتیں بے خیالی میں یا ایک آدھ بار کہی گئی ہوں بلکہ **ABVP** تو اسے نعرہ بنا کر کہہ رہا تھا۔اسی طرح **AISA** لیڈ **JNUSU** اور



**BAPSA**، نجیب کی حمایت میں لگنے والے نعروں، سلوگنس، چھپنے والوں پرچوں و پمفلٹوں میں **ABVP** کا نام مبینہ طور پر استعمال کرنے پر معترض تھا۔تیسری بات یہ تھی کہ اس معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کے بجائے معمولی کہا سنی اور مکمل غلط فہمی پر مبنی معاملہ قرار دیا جا رہا تھا۔اس تیسری کوشش کے پیچھے بھی **JNUSU** تھا۔ چنانچہ اس کی اس بدنیتی اور ''لاش'' پر سیاست کا خمیازہ **JNUSU** اور **BAPSA** کو شدید طور پر بھگتنا پڑا۔ان کے تئیں طلبا کی عام سولیڈیٹری اور حمایت تیزی سے کم ہوتی گئی، وہ الگ تھلگ سا ہو گیا۔ **ABVP** تو ان کا جانی دشمن تھا ہی، جس سے اس نے اقتدار چھینا تھا وہ تو ساتھ دینے سے رہا، چنانچہ چنتن منتھن کے بعد **JNUSU** اور **BAPSA** کو پھر طلبا کی عام حمایت حاصل کرنے کی چاہت ہوئی، زود پشیمانوں کی اس زود پشیمانگی پر حمایت ملی تو سہی، مگر تب تک دیر ہو چکی تھی اور طلبا **AISA** و **BAPSA** کو کسی مناسب موقع پر سزا دینے کا موڈ بنا کر ''نجیب مومنٹ'' کی قیادت خود اپنے ہاتھوں میں لے چکے تھے۔وہ ہر دن کیمپس میں ہیومن چین بناتے، کینڈل مارچ نکالتے، بینر، پوسٹر اور پلے کارڈ لے کر جے این یو کی سڑکوں پر نکلتے۔ان کی زبانوں پر بس یہی ہوتا:

**"#Where is Najeeb", "#Bring Back Najeeb", "#We Ask Where is Najeeb","#Justice for Najeeb","#Again We Ask, Where is Najeeb—"**

**''نجیب کو واپس لاؤ''۔'' ہمارا بھائی واپس لاؤ''۔''امی تم سنگھرش کرو، ہم تمہارے ساتھ ہیں''۔''نجیب کو واپس لانا ہوگا، ورنہ تم کو جانا ہوگا''۔''ہمیں نجیب چاہیے، جے این یو بولے، نجیب نجیب نجیب، دلّی بولے، نجیب نجیب نجیب، ہم**

www.urduchannel.in

**سب بولیں نجیب نجیب نجیب، میں بھی بولوں، تو بھی بول، نجیب نجیب نجیب——''**

یہ وہ نعرے تھے جو شدت سے گونجتے اور جے این یو کو نجیب آشنا کرتے۔ اس باران نعروں میں اس طرح کی شدت آئی کہ **2** نومبر **2016** کو جے این یو کے آزادی چوک میں نجیب کے تئیں سولیڈیٹری میٹ منعقد ہوئی جس میں دہلی کے وزیر اعلا اروند کجریوال، کانگریس کے سینئر لیڈر اور ایم پی ڈاکٹر ششی تھرور، جے ڈی یو کے جنرل سکریٹری، کے۔سی تیاگی سمیت کئی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی اور محمد نجیب کی ماں و بہن کے تئیں اپنی حمایتوں کا اعلان کیا۔ وزیر اعلا دہلی نے جے این یو ایس یو اور عام طلبا کو اس موقع پر انڈیا گیٹ پر کینڈل مارچ اور احتجاجی جلوس نکالنے کی دعوت دی جس کی سرپرستی کے لیے انھوں نے اپنی حکومتی اور تنظیمی مدد کا بھی اعلان کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انڈیا گیٹ پر ہونے والے احتجاج میں بھرپور ساتھ بھی دیا۔

اس موقع پر وزیر اعلا دہلی نے اپنے خطاب میں جو سب سے بڑی بات کہی وہ قابل غور و فکر ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

**"The police hasn't done any investigation. The message is clear.This country is subjected to hooliganism by BJP, RSS and the ABVP.**

انھوں نے مزید کہا:

**"If the ABVP is involved, the Delhi Police cannot have an Impartial Investigation".**

وزیر اعلا دہلی، اروند کجریوال کی یہ باتیں ایک حقیقت شناس اور بے باک شخص کی باتیں

www.urduchannel.in



تھیں۔ ان باتوں نے جے این یو ایس یو سمیت عام طلبا کو بھی ایک طاقت بخشی اور ان کی مومنٹ میں تازہ روح پھونک دی۔ واقعی پولیس کا رویہ غلط تھا اور وہ **ABVP** کی شمولیت کے باعث تفتیش میں حیص بیص کر رہی تھی۔ اس کا مسلم مخالف و جے این یو دشمن چہرہ صاف سامنے آرہا تھا، اسی طرح اس کے چہرے کے پیچھے جس طاقت کا ہاتھ تھا اس کا بھی پتا لگ رہا تھا۔ آر ایس ایس اور بی جے پی نے دلّی پولیس کو پابند کر دیا تھا کہ وہ نجیب معاملے میں کسی بھی قسم کی کارروائی سے گریز کرے۔ چنانچہ دلّی پولیس کی اس سرد مہری نے ایک بار پھر طلبا کو **''دلّی پولیس ہائے ہائے، دلّی پولیس مردہ باد، دلّی پولیس دلال ہے دلال ہے''** کہنے پر مجبور کر دیا اور وہ انڈیا گیٹ پر یادگار مارچ کے لیے کمر ہمت کسنے لگے۔

وہ موقع کسی طور نہیں بھولا جا سکتا کہ جب سولیڈیٹری میٹنگ سے ڈاکٹر ششی تھرور ''اپنی انگلش'' میں خطاب کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ کہتے کہتے یہاں پہنچے....

**''...یہ کتنے افسوس کی بات ھے کہ گذشتہ تین ھفتوں سے نجیب غائب ھے اور وی ۔ سی و دلّی پولیس اس کی فیملی کے درد کو سمجھ ھی نہیں رھے ،ھاں تک کہ ان ستم رسیدوں سے ملنا تک گوارا نھیں ھے ۔ یہ بات ھم سب کے لیے نھایت تکلیف دہ ھے ...''**

کہ اچانک نفیس فاطمہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں، باقاعدہ بین کرنے لگیں اور اپنے لخت جگر کے تئیں تڑپنے لگیں۔ ہم سب طلبا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کائنات رو پڑی ہو، کائنات کا صبر چھلک پڑا ہو اور اب کسی دم آسمان پھٹ پڑے گا۔ کتنا سوز تھا اس رونے میں اور کتنی نارسائی تھی اس آہ و بکا میں۔ تقریباً بیس منٹ تک وہ روتی رہیں، پھر خود ہی چپ

ہوگئیں، شاید صبر و قرار آ گیا تھا۔ وہ اکثر ایسے ہی موقع پر آ جاتا ہے اور گہرے گہرے زخموں پر چادر ڈھانپتا چلا جاتا ہے۔

اسی دوران میں، میں نوین کو چھیڑ کر اس کی رائے لینا چاہتا تھا، مگر مجھے اس نے کسی دانش مند کی طرح ہونٹوں پر انگلی رکھ کر منع کرتے ہوئے باتیں سننے کا اشارہ کیا۔

''اچھا——'' میں مختصر سا کہہ کر باتیں سننے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ میٹنگ کے بعد روم پر آ کر میں نے دیکھا تو وہ حسب معمول کتابوں میں گم تھا۔

''—— کیا ہوا تھارے بے ڈوڈ، چلا کیوں آیا وہاں سے؟ تُو تو بہت غور سے سن رہا تھا، مجھے بھی کہہ رہا تھا...'' میں نے آتے ہی اس کے سامنے سے کتاب ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری:

''—— کیا بتاؤں انیس! پتا نہیں تم کیا کہو، مگر مجھے تو کجریوال، ششی تھرور اور کے سی تیاگی کی باتوں میں ایک آنے کی بھی سچائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ششی جی ''اپنی انگلش'' کی دھاک بٹھا رہے تھے، ہمیں پتا ہے وہ پارلیمنٹ میں بھی اچھا بولتے ہیں مگر یہ ایسے موقعوں پر بھی تو انھیں سیاست سے باز آنا چاہیے تھا۔ یہ سیاست باز لوگ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع ہے، یہ ایک مظلوم کو حق و انصاف دلانے کے لیے مجمع لگا ہے۔ ایسے موقع پر تو کم سے کم اپنی راج نیتی سے باز رہیں.... مجھے ان سب کی باتوں سے سیاست کی بو آ رہی تھی سیاست بھی ایسی جو لاشوں پر کی جاتی ہے وہ، کسی کی جاں پر بنی، آپ کی ادا ٹھیری——!!'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ سے کتاب لے لی اور پھر ان سطروں کو پڑھنے لگ گیا جہاں سے میں نے اس سے کتاب چھینی تھی۔

www.urduchannel.in



افففف ظالم کتنی گہرائی میں اتر گیا تھا۔ میں سوچ کر رہ گیا۔ اجی سیاسی لوگ ہیں، سیاست تو کریں گے ہی، یہی ان کی آئیڈینٹٹی ہے اور یہی ان کا پروفیشن بھی۔

○○○

نومبر **2016** میں نئی دہلی میں مرکزی حکومت کے زیر انتظام سارک ممالک کی کانفرنس کی میٹ جاری تھی کہ جے این یو کے عام طلبا نے ''نفیس فاطمہ اور صدف'' کی قیادت میں **5** نومبر کو شاہجہاں روڈ سے پارلیمنٹ ہاؤس تک پرامن احتجاج کی کال دی، جسے ہزاروں طلبا و سیکولر شہریوں کی فوری حمایت ملی۔ یہ صورت حال دیکھ کر دلّی پولیس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے حفاظتی اور خود اختیاری اقدامات کرتے ہوئے انڈیا گیٹ کے سرکل سے گزرنے والے ڈاکٹر ذاکر حسین مارگ، پنڈارا مارگ، شاہ جہاں روڈ، اکبر روڈ اور راج پتھ پر دو دو کلومیٹر تک بریکیڈ لگا دیے۔ مگر پرجوش مظاہرین کا ریلا ان حدود کو توڑتا ہوا گزر گیا۔ دلّی پولیس کو یہ مزاحمت برداشت نہ ہوئی اور اس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ مظاہرین کو حراست میں لے کر بزور بسوں میں ٹھونسنا شروع کر دیا۔ لیڈیز پولیس نے نفیس فاطمہ اور صدف کو سڑکوں پر اس طرح گھسیٹا کہ ان کے کپڑے تک جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ خدا کی پناہ! اس دن نہ زمین کے سینے پر کوئی شکن آئی اور نہ آسمان کی مغرور پیشانی پر بل پڑے۔ معصوم فضا کی آنکھ سے بھی آنسو نہ ٹپکے۔ حسین کائنات بے حس کی بے حس بنی رہی.... اور خدا دیکھتا رہا۔

دلّی پولیس نے دوسرے دن یعنی **6** نومبر کو پریس کانفرنس کر کے نفیس فاطمہ اور صدف کے گھسیٹے جانے کی صاف لفظوں میں تردید کر دی بلکہ اوپر سے مہربانی کی داد وصول کرتے ہوئے یہ بکواس بھی کر دی کہ ہم نے تو انھیں گرنے اور چوٹ لگنے سے بچایا تھا اور بہ

حفاظت انھیں اپنی تحویل میں رکھا، ان کا خیال بھی کیا اور دھیان بھی رکھا.....'' اپنے ٹویٹر ہنڈل پر دلّی پولیس نے بے شرمی کی حد کرتے ہوئے لکھا:

**"A wrong impression about Delhi Police handling JNU protesters is being attempted. Najeeb's Mother wasn't manhandled. When Delhi Police were making the protesters Near National Archieves sit inside buses, she lied down in the middle of the road. Our female officers waited for the while and tried to persuade and explain to her but when she didn't heed to the lawful direction, the lady Police officials removed her from the middle of the road to ensure that she wasan't trampled in the crowd. She was taken to PStn alongwith the protesters and thereafter taken to her place of saty in Police Vehicle''**

قومی میڈیا کو اس لن ترانی پر حرف بہ حرف یقین آیا، اس کے لیے تو یہ پریس کانفرنس بریکنگ نیوز بلکہ اس دن کی تمام خبروں کا حاصل تھی، چنانچہ اس کے بعد وہ دلّی پولیس پر لگنے والے الزامات کا دفاع کرنے میں مصروف ہوگیا، مگر جے این یو کے طلبا کے گلے سے یہ

www.urduchannel.in



فریب اور جھوٹ نہیں اترا، وہ حقیقت جانتے تھے اور اس بات سے بہ خوبی واقف تھے کہ دلّی پولیس ہمیشہ کی طرح جعل سازی سے کام لے رہی ہے۔

اسی دن نفیس فاطمہ کا آنکھیں کھول دینے والا بیان اور ویڈیو سوشل میڈیا پر آیا۔ جس میں وہ کہہ رہی تھیں ''مجھے بیٹے سے ملوانے کا کہہ کر دہلی پولیس ساڑھے تین گھنٹوں تک سڑکوں پر ہی گھماتی رہی۔ ہمارے زخموں سے خون رِس رہا تھا۔ میں اور صدف کہہ بھی رہے تھے کہ ہمیں فرسٹ ایڈ دے دو، مگر دلّی پولیس کی فی میل آفیسرس ہماری ایک بھی نہیں سن رہی تھیں۔ دہلی پولیس اس کو پانچ بجے مایاپوری پولیس اسٹیشن سے یہ کہہ کر ساتھ لے گئی وہ اس کو بیٹے سے ملوانے کے لیے لے جا رہے ہیں، مگر ساڑھے آٹھ بجے تک وہ اس کو دہلی کی سڑکوں پر گھماتے رہے اور پھر چھوڑ دیا۔''

پولیس کی زیادتی اور اس پر الٹے سیدھے بیانات سے اس دن جے این یو کا بچہ بچہ اداس تھا۔ ہم سب کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہماری ماں روڈ کر گھسیٹی گئی ہے، ہماری بہن کی روڈ پر گھسیٹی گئی ہے۔ میں بھی، نوین بھی بلکہ اس کی گہری آنکھوں میں تو آج اداسی کچھ سوا تھی۔ ایسی اداسیاں اکثر کسی دیرآمدہ خطروں کو بھانپنے کی علامت ہوتی ہیں۔

''—— انیس! اب جے این یو شریفوں کے رہنے کی جگہ نہیں رہا، اب جے این یو سے دل بری طرح اچاٹ ہوگیا۔ یہاں سالا بندوں کو ترسنے والی **ABVP** کو، وی سی اور پولیس کا ساتھ مل رہا ہے اور وہ اپنا قد بڑھاتی ہی جا رہی ہے—— 'نوین نے گہری سوچوں کے درمیان کہا اور میں اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی الہام بیان کر رہا ہو۔ اس کی باتوں میں کتنی سچائی تھی، جے این یو اب جے این یو نہیں رہا تھا بلکہ اب وہ قتل گاہ بنتا جا رہا تھا۔ اب یہ بات محسوس ہو رہی تھی کہ اب یہاں کے طلبا ہوشیار اور خود

حفاظتی کے اصولوں سے واقف نہ ہوئے تو کتنوں کا حال محمد نجیب جیسا ہوگا۔

کچھ طلبا پولیس کی اس زیادتی اور جعل سازی کے خلاف اخبارات میں مضامین لکھ رہے تھے اور کچھ سوشل میڈیا پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے:

**Shame on Delhi Police. They must learn some ethics. Is this d way to handle a grieving mother?**

(نازش عمر کی فیس بک وال سے)

**What is the truth about Najeeb? ABVP mob assaulted him, threatened to kill him & send him to "72 hoors." Next day, he goes missing. @Delhi Police which is very active in the case of alleged assault of Chief Secretary, didn't even arrest the ABVP guys who may have abducted Najeeb!!**

(شہلا راشد شوری کے ٹویٹر ہنڈل سے)

جے این یو کے طلبا اپنے اپنے طور پر پولیس کا بائیکاٹ کر رہے تھے، نجیب کے لیے لکھ رہے تھے، اس کی تلاش میں سرکاری طور پر ہونے والی کوتاہیوں کی سرزنش کر رہے تھے اور دلّی پولیس کی ہر چال ناکام بنانے اور اس کا مکروہ چہرہ بے نقاب کرنے کے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کر رہے تھے۔ نجیب کا غم جے این یو سے باہر بھی اسی شدومد سے منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر میں میوات جیسے دور افتاد اور غیر ترقی یافتہ علاقے میں نجیب پر گزری انہونی پر، ری ایکشن سامنے آیا۔ یہاں کے ایک میواتی شاعر لیاقت خان نے اس واقعے

www.urduchannel.in



پر گیت کے ذریعے اپنے درد کا اظہار اس طرح کیا:

گھر سے کالج گیا تھا پڑھنے——

آج تک نہیں آیا——

ماں کی انکھیاں ترس گئیں——

نجیب لال نہیں آیا——

کیسے کیسے ظلم ہو چکے——

بگڑا بھائی چارہ——

ان چند سطور میں لیاقت خان نے جگر چیر کر رکھ دیا۔ نجیب کے حادثے کو ہر دل کا روگ بنا دیا اور اس کی ماں، بہن و بھائی کے غم میں سب کو شریک کر دیا۔

اس زمانے کے دن رات یہ کیسا تماشا دیکھ رہے تھے کہ جو بچے جے این یو میں پڑھنے، اپنی زندگیاں بنانے اور ملک کی تقدیر سنوارنے کا خواب لے کر آئے تھے، وہی اب ملک کو برباد کرنے والوں سے وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ وہ خود لٹ پٹ کر اپنے گھر یعنی جے این یو کو بچا رہے تھے۔ اس دوران میں جگو وی۔سی اور اس کے ہم نوا، مسلسل خاموش تھے بلکہ اپنی خاموشیوں پر مزید تالے جڑ رہے تھے۔ وہ نہ تو نجیب کی ماں سے مل رہے تھے اور نہ ان غم زدوں کی غمگساری کر رہے تھے۔ کتنے بے حس تھے وہ یا کوئی انسان اتنا بھی بے حس ہو سکتا ہے، ایسا پہلی بار دیکھنے کو ملا تھا۔ ان لوگوں پر پورے ملک کے طلبا و اساتذہ کے احتجاج کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

○○○

دلّی ہائی کورٹ کے حکم پر دلّی پولیس سے سی بی آئی کو سونپے گئے نجیب کیس کی ڈیڈ لائن ختم

ہورہی تھی۔آخری دن نفیس فاطمہ نے سوشل میڈیا پر پھر نجیب کی گہار لگائی اور سیکولر مزاج عوام سے درخواست کی کہ اس کے بیٹے کے حق میں آواز اٹھانے کے لیے لودھی روڈ پہنچیں۔

جیسے ہی یہ ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہوا۔ایک بڑی تعداد نے اسے لائک، ہارٹ، سیڈی، انگری جیسی اموجیز دیں، کمنٹس باکس میں ان کے تئیں ہمدردی والے کمنٹس بھی لکھے۔وہیں کچھ لوگ نے دل آزاری کرنے والے کمنٹس لکھنے سے بھی باز نہ آئے۔وہ لکھ رہے تھے:

''ماں! جی ذرا پتا کرنا کہیں تمھارا نجیب عراق یا سیریا میں تو نہیں ہے۔''

''ماں جی خبر تو کرو کہیں وہ آئی ایس آئی کی ناپاک گینگ میں نہ چلا گیا ہو۔''

''نفیس فاطمہ تو کتیا، تیرا بیٹا پلا، تو دہائی دیتی رہ، تیرا پلا نہیں ملے گا——''

اف اف خدایا——! انسانیت کے دشمنوں کی یہ کیسی زبان تھی اور کیسے تیور؟! ایک مظلوم کے دل پر کیا گزر رہی تھی، اس سے بے پروا، یہ شر پسند اپنی ذہنی خباثت کی تسکین کر رہے تھے اور کوئی ان کو روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔

○○○

ایک مہینے بعد نوین مجھے سمجھا رہا تھا، جب میں نے اس سے کہا کہ اگر یہی حالات ہیں تو بہتر ہوگا کہ میں واپس میوات کے جنگلوں میں چلا جاؤں۔اپنے گھر چلا جاؤں۔اب میں اس شہر نامراد سے واپس ہو جاؤں، سلیم، راہل، چرنی، راجیش کے پاس چلا جاؤں، جن سے بچھڑے اب ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصے میں وہ کئی بچوں کے باپ اور جھونپڑوں و باپ دادا سے وارثت میں ملے کھیتوں کے مالک بن گئے ہیں۔میں اپنے دیس چلا جاؤں جہاں میرا معصوم بچپن دفن ہے۔مگر نوین مجھے میرے ارادوں سے باز رکھ رہا تھا۔

www.urduchannel.in



مجھے روک رہا تھا۔مجھے سمجھا رہا تھا۔اس کی باتوں میں سچائی تھی۔وہ کہہ رہا تھا:

''سوچ لو——! میں پھر کہتا ہوں، جانے کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔میوات گئے تو یہاں کی آگ میوات بھی پہنچ سکتی ہے۔تم جانتے ہونا، اس جلوس میں تم بھی تھے اور اب یہاں پولیس والے باقاعدہ ایسے تمام جلوس کی ویڈیو فوٹیج رکھتے ہیں اور پھر ایک دن ان ویڈیو فوٹیج میں سے کچھ لوگوں کو باہر نکال کر میڈیا انھیں دیش کا سب سے بڑا ویلن بنا دیتا ہے یعنی غدار——''

دلّی پولیس کے سرویلانس راڈار پر اب ایسے لوگ چڑھ چکے تھے اور میڈیا کی چوتھی، پانچویں، چھٹی، ہر آنکھ ''ان غداروں'' کو دیکھ رہی ہے۔میں میوات کو اس آگ میں کسی طرح بھی نہیں جلا سکتا۔میوات تو خود آگ کے دہانے پر کھڑا ہے۔وہاں کی اپنی تہذیب، اپنا سماج، اپنے باشندے، وہاں کی علاقائی سرکاریں بھی اس خطے کو مزید آگ میں جھونک رہی ہیں۔وہاں کے کھیتوں میں اگنے والی فصلیں وہاں کے کسانوں اور کاشت کاروں کی بھوک کسی طور نہیں مٹا سکتیں، اس پر مزید میرے ذریعے وہاں آگ لگے، یہ میں کسی طرح نہیں کر سکتا تھا۔لہٰذا میں نے دلّی میں، جے این یو میں ہی کورس کی تکمیل تک خود کو ان حالات کے حوالے کر دیا جو جے این یو کے قلعے کی فصیلیں توڑتے ہوئے داخل ہو چکے تھے اور ہر پل اسے برباد کر رہے تھے۔

○○○

## (7)

### یوں حقیقت کا فسانہ بن گیا ——

محمد نجیب کے اغوا کے بعد **ABVP** پردے کے پیچھے چلا گیا۔ چوں کہ دلّی پولیس اس کی ذمے داری اور ایمان داری سے پشت پناہی کر رہی تھی۔ مگر جب جے این یو کے طلبا پر اس کی قلعی کھلی اور ان کے ذریعے چھپنے والے پوسٹروں میں **ABVP** کو آڑے ہاتھوں لیا گیا تو **JNUSU** کے سابق جوائنٹ سکریٹری نیرَ وُشرما نے اینٹی جے این یو میڈیا کو کیمپس میں بلا کر اوپن ہاؤس پریس کانفرنس کی۔ جس میں اے بی وی پی کو ملک دوست اور سچا دیش بھکت کہتے ہوئے، جے این یو کے عام طلبا اور جے این یو ایس یو و دیگر تنظیموں کو صاف لفظوں میں ملک دشمن کہہ دیا۔ خود پر یعنی **ABVP** پر لگنے والے الزامات کو نہایت سختی سے مسترد کرتے ہوئے، ان کو اپنے خلاف کی جانے گہری سازش کہا، نیز یہ سلسلہ نہ رُکنے کی صورت میں کورٹ کچہری کی بھی دھمکی دے دی۔

جب ایک صحافی نے پوچھا کہ دلّی پولیس کے ذریعے کیے جانے والے پالی گراف ٹیسٹ کے لیے **ABVP** اسٹوڈنٹس نے منظوری دی ہے، اس سے تو لگتا ہے کہ **ABVP** اس معاملے میں شامل ہے، تو نیرَ وُشرما نے اس کی ماؤتھ آئی ڈی کھینچ کر اسے ہی دے ماری۔ یہ واقعہ دیکھ کر صحافی برادری بھڑک گئی مگر بہت جلدی اسے احساس ہو گیا کہ وہ

www.urduchannel.in



**ABVP** اور نیرَ وُشرما، **RSS** اور **BJP** کے چہیتے ہیں اور **RSS** و **BJP** اس ملک کی مالک ہے، بلکہ میڈیا گھرانوں کی مالک ہے۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ انھیں کچھ نہ کہا جائے اور **Sorry** بول کر معاملہ رفع دفع کر لیا جائے، چنانچہ یہ احساس ہوتے ہی دیگر صحافی سوال کرنے والے کو ہی برا بھلا کہہ رہے تھے۔ سنا گیا ہے کہ اس کے چینل والوں نے بھی اس کی سرزنش کی اور اس کی اس مہینے کی پوری سیلری سے اسے محروم کر دیا۔

ان ناخواشگوار واقعات کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹے چلنے والی اس پریس کانفرنس میں نیرَ وُشرما اور اس کے ہم نوا کسی بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ وہ صہیونی قوم کی مانند جذباتی ہو کر یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس دنیا میں ان سے زیادہ معصوم اور مظلوم کوئی اور نہیں ہے۔ جے این یو میں ان کی کردار کشی کی گئی ہے۔ نجیب کی گمشدگی کا ذمے دار انھیں ٹھیرایا گیا جب کہ اس نے تو ہمارے ہی ساتھیوں کو مارا اور ان کی ریسٹ پر کلادہ پہننے پر اعتراض بھی کیا تھا۔ یعنی ہم نے کچھ بھی نہیں کیا اور ہمیں ہی زمانے میں رسوا کیا جا رہا ہے، جے این یو کا کیمپس ہم پر تنگ کیا جا رہا ہے وغیرہ —— اور میڈیا کو ان کی ایک ایک لن ترانی پر ایمان آتا گیا۔ اس دن شام میں چینلس پر جو اسٹوریز چلیں انھیں ملک کے فسطائی طبقے کی جانب سے بے تحاشا وویونکس، لائکس، تھمبس و ہارٹس ملے اور چینلس ریٹنگ لے اڑے۔ دلّی پولیس نے بھی اس دن اپنے اپنے تھانوں میں جشن منایا۔ جے این یو محمد نجیب کے ساتھ کھڑا تھا اور ملک کا فسطائی طبقہ و دلّی پولیس، **ABVP** کے سر پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔ پھر اس طرح سے بہت تھوڑے اور نہتے طلبا کی مہم دم توڑتی چلی گئی۔ محمد نجیب کا کیس، اس کی بازیابی کی تحریک اور جے این یو میں دیگر چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے حل کے لیے اٹھنے والی تحریکیں کسی شمع کشتہ کی مانند بجھ گئیں۔ کیمپس میں اندھیرے ہی اندھیرے پھیل گئے۔ ممی

ڈالا جگدیش کمار ہائی کورٹ سے ایک عجیب سا آرڈر لائے جس کے مطابق ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ کے **100** میٹر کے دائرے کے اندر کسی بھی قسم کے پروٹیسٹ، میٹنگ، ریلی، جلوس، گیدرنگ، نعرے بازی اور جمع ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بعد جے این یو کے پنک پیلیس کے دامن میں واقع آزادی چوک سونا ہوگیا۔ وہاں بنے ہالوں اور کمروں میں آہنی سلاخیں لگادی گئیں، جہاں اسٹوڈینٹس بیٹھتے اور وائی فائی چلاتے تھے۔ ''فریڈم اسکوائر'' کے اس کا اسٹیج بننے والی سیڑھیوں پر پودوں کے گملے رکھ دیے گئے۔ اس طرح باغوں میں بہار آگئی۔

ہائی کورٹ کے اس آرڈر سے فیض احمد فیضؔ کا یہ شعر اپنے وسیع تر مفاہیم میں ایک بار پھر سچ ثابت ہوگیا:

بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی منصف بھی!
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں!!

اسی طرح عبدالصمد تپشؔ کا یہ شعر بھی:

وہی قاتل، وہی منصف بنا ہے!
اسی سے فیصلہ ٹھیرا ہوا ہے!!

کم سے کم ہائی کورٹ سے تو ایسی امید نہ تھی، اسے تو زمانے، سیاست، سامراج، دولت اور پیسے والوں کا ستایا ہوا ایک عام آدمی اپنا آخری سہارا تصور کرتا ہے۔ اسے تو اس کی ہی بپتا سن کر مدد کرنی تھی! یہ تو پتا نہیں کہ اس سے عدالت کا وقار مجروح ہوا کہ نہیں، تاہم اتنا ضرور پتا ہے کہ ملک کی فسطائیوں طاقتوں اور فسطائیت ذہنیت و آئیڈیالوجی کے طلبا کی مرادیں ضرور برآئیں۔

www.urduchannel.in



جے این یو میں اب احتجاج، مظاہرے، مارچ سب بند ہوگئے۔ سالانہ امتحانات سر پر تھے، ناکامی پر سخت سرزنش بلکہ اخراج تک کا نوٹیفکیشن آچکا تھا۔ لہٰذا طلبا کو اپنی موجودہ سرگرمیاں ختم کرنی پڑیں اور محمد نجیب، نفیس فاطمہ کا دلارا، صدف کا ''نجو'' گمشدگی کے کالے کالے گہرے بادلوں میں کھوتا چلا گیا۔ وہ حقیقت تھا، فسانہ بن گیا۔ وہ سانسیں لیتا تھا، کہانیوں کا کردار بن گیا۔

○○○

ان دنوں کرکٹ ٹورنامنٹس کی عالمی تنظیم ''آئی سی سی'' کی جانب سے چمپئن ٹرافی کے مقابلوں کا اعلان ہوا۔ جنھیں حسب معمول اسٹارون، اسٹار ہندی اور اسٹار پلس جیسے اسپورٹس چینلس نے نشر کیا۔ اس کے اولین مقابلوں میں سے ایک مقابلہ ہندو پاک کے درمیان منعقد ہوا جس میں ہندوستان فاتح ہوگیا۔ ہندوستان کی اس فتح پر گو ہم سب ہندوستانیوں کو خوشی تھی مگر **ABVP** اس میں حدوں کو ہی پار کر گیا۔ کے سلبریشن کے لیے باقاعدہ کیمپس میں جلوس نکالا۔ یہ جلوس نعرے لگاتا ہوا رنگ روڈ ہوتے ہوئے چندر بھاگا ہاسٹل پہنچ رہا تھا کہ **ABVP** نے ایک ساخشانہ گھڑا اور خود ہی شور مچانے لگے کہ **AISA** اور مسلم اسٹوڈینٹس ہمارا ہندوستان کی جیت پر جشن منانا پسند نہیں آیا اور وہ ہم پر حملہ آور ہوگئے۔ اس الزام کا نہ کوئی منطقی ثبوت تھا اور نہ ہی عقل میں یہ باتیں آتی تھیں مگر اسی رات **JNUSU** کے سابق جوائنٹ سکریٹری اور **ABVP** جے این یو کے صدر نیرَ ڈ شرما نے زی نیوز [جے این یو کے طلبا اسے چھی نیوز اور اس کے اینکر کو سدھیر تہاڑی کہتے ہیں] اور دیگر جے این یو مخالف چینلس کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی، جس کے بعد یہ خبر بریکنگ نیوز بن کر چینلس کی اسکرین کے چاروں خانوں پر ملٹی لینگویجز میں چلنے لگی۔ جے این یو، جے این یو کے طلبا اور جے این یو کا وجود پھر میڈیا کے نشانے پر آگیا جس کا بیان وہ

اس طرح کر رہا تھا کہ اب جے این یو کو مزید برداشت نہیں کیا جانا چاہیے اور اس پر ٹینگ، بندوقیں، کلہاڑے، پھاوڑے، بلڈوزرس، کرینیں لے کر چڑھ جانا چاہیے اور دہلی کی زمین سے جے این یو کو مٹا دینا چاہیے۔ مگر بہت جلد میڈیا کی یہ لن ترانیاں خود ہی دم توڑتی چلی گئیں۔ خود ہی اس کا منہ بند ہو گیا اور، **ABVP** بھی اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکی، بلکہ اسے خود افسوس ہوا کہ اس نے اس کیس کی بلڈنگ میں جلدی کر دی اور اسے بہت زیادہ سمجھ داری سے بنانے کے بجائے جلد بازی اور ناسمجھی سے بنا دیا، جس کا کھوکھلا پن دوسرے دن ہی سب کے سامنے آ گیا۔ **ABVP** ہاتھ ملتا رہ گیا۔

○○○

یہ سال جیسے تیسے گزر رہا تھا۔ نوین جے این یو چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ میری طرح بے حس اور مصلحت پسند نہیں تھا۔ اسے جے این یو میں اپنا مستقبل مخدوش نظر آ رہا تھا، اس لیے وہ ایک دن روم نمبر **259** کو ویکنٹ کر گیا۔ اب روم میں اس کی سانسیں، اس کی یادیں، اس کی باتیں ہی بسی رہ گئیں۔ مجھے نوین کی عادت ہو چکی تھی۔ اب میں ان ہی سے باتیں کرتا تھا۔ اس کا خالی بستر مجھے اس کی کتنی ہی یادیں دلاتا اور اس کے بدلے بدلے رویوں کی گہرائی میں اترنے کی دعوت دیتا۔ کبھی کبھی جب میں باہر سے آتا تو باوجود اس کے کہ وہ روم میں نہیں تھا، اس کا خالی بستر مجھے اس کے وجود کا احساس کراتا، اس کی سانسیں اور اس کی باتیں مجھے اس کے ہونے کا احساس دلاتیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا جیسے نوین تیز سانسیں لے رہا ہے اور ابھی کسی دم میں **JNUVC** کی جانب سے آنے والے کسی نئے فرمان/نوٹس کے بارے میں بتائے گا اور پھر اپنی رائے دے گا، جس میں ذہنی کرب و پریشانی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ کبھی کبھی مجھے خالی روم میں بہت گھٹن ہوتی، میں گھبرا کر باہر نکل آتا، مگر باہر کی فضا اس سے بھی زیادہ کثافت سے بھری لگتی۔ یہ عالم دیکھ کر اچانک لبوں پر یہ بند رواں ہو جاتا:



سہمی سہمی ہے فضائے جے این یو!
اتری اتری ہے ردائے جے این یو!!
کون اس کا لے گیا چین و قرار!
بدلی بدلی ہے ادائے جے این یو !!
جے این یو سے پایا ہے، ہم نے اپنا مرتبہ
جے این یو ہم پر فدا ہے، ہم فدائے جے این یو
ہائے میرا جے این یو، وائے میرا جے این یو

---

یہ بند بلکہ یہ پوری نظم مجھے نالہ وشیون کے بعد کچھ سکون بخشتی تھی، میں اسے اس طرح گنگناتا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو لوریاں سناتی ہے اور وہ انھیں سنتے سنتے سو جاتا ہے۔ کبھی کبھی میں تڑپ کر اس طرح چپ ہو جاتا جیسے کوئی بچہ پہلے تو اپنی مطلوبہ چیز نہ ملنے پر روتا ہے اور دیر تک رونے کے بعد، چپ ہو کر سو جاتا ہے، آنسو اس کے چہرے پر اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

○○○

تعلیمی سال **2016** اپنے آخری دنوں میں کا سفر طے کر رہا تھا، **2016-2017** کی تعلیمی میقات کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس مرتبہ بہت تھوڑے سے طلبا کا داخلہ ہوا، سیٹ کٹنگ نے متعدد ہونہار اور محنتی طلبا کو جے این یو چھوڑنے پر مجبور کر دیا، تاہم اچھی خاصی تعداد ابھی باقی تھی۔ نئے طلبا کا استقبال جے این یو کی طلبا تنظیمیں جوش وخروش سے کر رہی تھیں۔ جے این یو کے پرائم لوکیشن پر ''**WELCOME FRESHERS**'' کے بینر لگائے گئے۔ اسی کے ساتھ **JNUSU** کے **2017** کے انتخابات کا نوٹیفکیشن بھی جاری ہو گیا اور **CONTEST** کرنے والی تنظیمیں برساتی مینڈکوں کی مانند میدان میں آ گئیں۔

www.urduchannel.in

ABVP اور BAPSA کے بڑھتے قد، گزشتہ کارکردگیوں اور قریبی فائٹس کو دیکھ کر اس مرتبہ آل انڈیا اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن [AISA] کے چہرے پر شکست صاف جھلک رہی تھی، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ SFI کے ساتھ مل کر بھی لیفٹ کا قلعہ نہیں بچا سکتی، اس لیے سخت کشمکش میں تھی ۔اچانک اسے اندھیرے میں امید کی ایک کرن، ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹ فیڈریشن [DSF] کی صورت میں نظر آئی۔ پھر اس طرح لیفٹ کی تین تنظیموں نے مل کر لیفٹ یونائیٹڈ بنالیا۔ اے بی وی پی، باپسا اور دیگر تنظیموں نے اس اتحاد کو ''للو، چنو، منو'' کی جوڑی کہا۔ مگر اس جوڑی نے مل کر اچھی کوشش اور شاندار مظاہرہ کیا اور اس مرتبہ پھر جے این یو میں لیفٹ کا پرچم لہرا دیا، تاہم لیفٹ کی پیشانی پر ہارتے ہارتے بچنے کا پسینہ دور سے بھی نظر آتا تھا۔ یسا لگتا تھا جیسے کسی پہلوان نے انھیں ریسلنگ اسٹیڈیم میں بری طرح رگڑا ہو مگر وہ خوش قسمتی سے بچ گئے ہوں۔ جے این یو ان کا مشکور تھا کہ اس کا لال لال پن ،کسی طرح ہی سہی، بھگوا ہوتے ہوتے بچا۔ دائیں بازو اور دلت آئیڈیالوجی کی تنظیمیں 2017 کے JNUSU انتخابات میں شکست کا تیر کھا کر رہ گئیں۔

میں آج پھر حسب معمول ''نوین'' سے عالم تصور میں کہہ رہا تھا:

''—— دیکھ ڈوڈ! لیفٹ پھر جیت گیا، جے این یو کی فائیٹنگ بیک ہو رہی ہے، ڈوڈ! جے این یو کا لال قلعہ کوئی نہیں توڑ سکتا۔ تم کتنے بزدل تھے، چلے گئے، دیکھو جے این یو پھر سے ری کوری کر رہا ہے——'' میں پرجوش انداز میں کہہ رہا تھا اور اس پر اپنی جوش بیانی کی دھاک بٹھا رہا تھا کہ اچانک نوین کے خالی بستر سے آوازیں آنے لگیں:

''—— انیس! تم بہت بھولے ہو، بہت باؤلے ہو، پاگل ہو، کیا تم نے دیکھا نہیں اس مرتبہ JNUSU جیتنے میں للو، چنو اور منو کو دانتوں پسینے آ گئے تھے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ریڈ آرمی سے اب جے این یو کے قلعے کا تحفظ مشکل ہے، وہ دن بہت دور نہیں جب

www.urduchannel.in



جے این یو بھگوا رنگ سے رنگ دیا جائے گا اور یہاں ملک کے حق و انصاف کی باتیں ہونے کے بجائے فاشزم اور فسطائیت کو بڑھاوا ملے گا۔ یہاں اس کے پرچار ہوں گے۔ ملک کے اکثریتی طبقے کی شر پسندیوں کے لیے یہاں خام مال تیار ہوگا۔ یہاں ملک میں دنگا، فساد اور ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کو ختم کرنے کے منصوبے بنیں گے۔ یہاں شاکھائیں بنیں گے اور ان میں بھارت ماتا کے تحفظ کے لیے مسلمانوں اور اقلیتوں کا خون بہانے کے سنکلپ لیے جائیں گے۔ اپنی اس کارروائی بھارت ماتا کے یہ نام نہاد بھکت بھارت ماتا کے ہت میں کہیں گے، وقت اور ماحول بھی ان کا ساتھ دے گا جس کے بعد انھیں کھلی شر پسندی کا سرٹیفکٹ مل جائے گا، تم دیکھنا——''

''بس بس، چپ کر تم ایسے ہی کہتے رہتے ہو——'' مجھے غصہ آ گیا۔ جواب میں نوین کا خالی بستر تصور میں ہی چھت شگاف قہقہے لگا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو:

''—— انیس! فیصلہ تو ہو چکا، تمھارے غصہ ہونے یا نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے، خدا کرے کہ تم وہ دن دیکھو، جب میری کہی ہوئی باتیں سچ ثابت ہوں——'' وہ اس سے پہلے کہ کچھ اور کہتا، میں گھبرا کر باہر آ گیا۔ کامن روم کی بیرونی بالکنی تیز دھوپ سے جل رہی تھی اور ہاسٹل کے اوپر سے قطر ائیرویز کا طیارہ نمبر Q-A/C-33 گزر رہا تھا۔ اس کی پرواز اتنی نیچی تھی کہ پہیے بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ طیارہ بتدریج IGI کے ٹرمینل۔3 پر اتر رہا تھا۔ پھر وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی گڑگڑاہٹ بھی معدوم ہوتی گئی، اس کے بعد وہی سناٹے پسر گئے۔ فضا کسی آبرو باختہ دوشیزہ کی مانند ہلکی ہلکی سسکیاں لے رہی تھی، ان سسکیوں میں اس کی کربنا کی صاف دکھ رہی تھی۔

○○○

## (8)

### ہمیں وقت نے کیا کیا جلوے دکھائے ——

گو غیر لیفٹ پارٹیز بظاہر شکست کھا گئی تھیں مگر اپنے وجود کا احساس وہ طلبا میں کرا گئیں، **ABVP** کا بڑھا قد، وی سی ممی ڈالا کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ چنانچہ انھوں نے نئے سال میں ایک بار پھر سخت جاں فرامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نوٹس، بھیجنا، اسٹوڈینٹ پر فائن لگانا اور ہر دن کوئی نہ کوئی نیا نوٹیفکیشن آتا اور طلبا سراپا احتجاج بن جانا اب روز کا معمول بن چکا تھا۔ کیمپس میں ہیومن چین بناتے اور گنگا ڈھابہ ٹو چندر بھاگا ہاسٹل مارچ کی کال دیتے۔ جے این یو کی لبرٹی خطرے میں پڑ جاتی۔ کینڈل برننگ ہوتی، نوٹس اور فرامین کی واپسی کا مطالبہ کرتے، مگر یہ صدا، جے این یو کی سخت فضاؤں میں گونج کر رہ جاتی یا کسی بے اثر دعا کی مانند اُلٹی مار دی جاتی۔ ان سب وارداتوں نے جے این یو کا اسٹبلشمنٹ، یہاں کی تعلیمی فضا اور علمی و تربیتی ماحول پوری طرح سے متاثر کر دیا۔

نئے سال کی ابتدا میں ہی جے این یو کے برے دن شروع ہو چکے تھے۔ دیش کی طرح جے این یو بھی بدل رہا تھا، آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں کے انتظامیہ ہاؤس اور وی سی لاج میں بھی وہی ریکارڈ بج رہے تھے جو 2017 کے شروع میں مرکزی حکومت نے حکومت کی کامیابیوں اور فرضی وکاس کے آدھار پر، پیوش پانڈے اور ہمنواؤں کی آواز میں ریڈیو، ٹی

www.urduchannel.in



وی، یوٹیوب سب جگہ اپلوڈ کر دیا تھا۔

**دیکھو آسماں میں کھل کر، سورج نکل رہا ہے**

**دیش کا پرچم اب، اونچا اڑ رہا ہے**

**برسوں کا اندھیرا روشن ہو رہا ہے**

**غریب کی رسوئی سے دھواں ہٹ رہا ہے**

**مرا دیش ...مرا دیش...مرا دیش...**

**مرا دیش بدل رہا ہے، آگے بڑھ رہا ہے....**

ایک طرف یہ عالم، دوسری طرف یہ عالم کہ جیسے ہی جے این کے کامن اسٹوڈینٹس یا **JNUSU** کی آواز پر لبیک کہنے والے طلبا کسی نامناسب اور تکلیف دہ فرمان پر احتجاج کرتے، **G4S** کے سکیوریٹی اہلکاران کی ویڈیو بنا کر، نام جان کر ایڈمن بلاک میں بھیج دیتے، دوسرے دن وہاں سے ان کے نام، پروکٹر، وی سی اور دیگر ذمے داروں کے سگنیچرس کے ساتھ نوٹس آتا، جس میں ہاسٹل ٹرانسفرنگ، فائن، وارننگ سے لے کر اخراج تک کی دھمکیاں ہوتیں، اس سے طلبا پر دو اعتبار سے نفسیاتی دباؤ پڑتا۔ اول یہ کہ وہ بدنامی کے خوف سے ڈر جاتے، دوم انھیں جے این یو میں ملنے والی اپنی ہی محنت کی آزادی، قیمت ادا کر کے ملنے والی محسوس ہوتی۔ اب وہ ہائی کورٹ کے متعین کردہ **100** میٹر کے دائرے سے بھی دور رہنے لگے اور وی سی کے کان اس سمع خراشی سے محفوظ ہو گئے جس نے بقول ان کے جینا، مشکل کر دیا تھا، نیز وہ کام سکون و اطمینان سے نہ کر سکتے تھے۔ جے این یو کا پنک پیلس اب سونا ہو گیا اور اس کے اوپر سائبان فلک تیز دھوپ اور تیز ٹھنڈ گزار کر وہ چلا جاتا، اسے اپنی شدت کا خراج بھی نہیں ملتا اور نہ ہی حوصلۂ سوزگی ہی۔

○○○

جے این یو میں ان دنوں کچھ فیکلٹی ریکوارمنٹ آئیں تھیں، وہ آئیں اور بہت جلد غائب ہوگئیں، ان کی فُل فِل دائیں بازو کے حامی اساتذہ سے کردی گئی۔ **JNUVC** کے اس ناروا سلوک اور اپنا غیر مناسب اثر تھوپنے پر اس وقت کی **JNUTA** صدر، عابشہ قدوائی کی صدارت میں **JNUTA** نے اس اقدام پر سخت ایکشن لیتے ہوئے سابرمتی گراؤنڈ میں ہفتۂ تحریک کا آغاز کر دیا۔ **JNUTA** کی دعوت پر ان دنوں **DU**، **JAMIA**، **AMU**، **ALLAHABAD**، **LUCKNOW**، **HCU** وغیرہ سے ٹیچر آئے تھے اور سب نے وی سی کی اس حرکت پر کھلے لفظوں میں تنقید کی۔ وی۔سی سے انصاف کی گہار لگائی۔ جے این یو کے سیکولرزم کو بچانے کے لیے ریزولیشنس اور قراردادیں پاس کیں مگر افسوس! وہ ہفتۂ تحریک، خاطر خواہ نتائج برآمد کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔ جے این یو ٹی اے کا ایک اچھا خاصہ وقت اس کے لیے برباد ہوا۔ پھر ایک دن ٹینٹ والے لوہے کی سیڑھیوں پر چڑھ کر قناتیں اور سائبان اتار رہے تھے، بلیوں کا اکھاڑ کر لائٹ اینڈ ٹینٹ ہاؤس کے ٹرک میں بھر رہے تھے۔ مجھے اس دن نوین کی بہت یاد آئی، اس کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں، اس کے وہ تیور یاد آئے جو اکثر ایسے وقت، اس کی پیشانی پر ابھر آتے تھے اور میں سہم سا جاتا تھا کہ خدایا اب یہ کیا الہام کہے گا۔ اچانک اس کا خالی بستر ایک تھرتھراہٹ کے ساتھ بج اٹھا ایسا لگ رہا تھا جیسے تیز اور شورانگیز آندھیاں اچانک کمرے میں گھس آئی ہوں.....

''—— ھاھاھاھاھا انیس! کب تک خود کو بہلاتے رہو گے؟ تمھیں سمجھ کب آئے گی؟ تمھارا کیا بگڑ جائے گا اگر تم اس بات کو مان لو کہ جے این یو کے اچھے دن بھی لد گئے اور اب یہ برے دنوں میں داخل ہو چکا ہے۔ اب اس کا نقشہ تبدیل کر دیا گیا اور اس کی عظمتیں

www.urduchannel.in



کچل دی گئیں۔ تم جتنی جلدی ان باتوں کو تسلیم کر لو گے، اتنا ہی اچھا ہے، ورنہ ایک دن کسی ناسور زدہ شخص کی طرح خون تھوکتے پھرو گے، تم ذہنی مریض ہو جاؤ گے اور تمھیں مینٹل اسپتال، آئی مین پاگل خانے بھیج دیا جائے گا... .ھاھاھاھاھا—— ''نوین کے شوخ وطنزیہ، نصیحت آموز قہقہے جس شور و ہنگامے سے کمرے میں داخل ہوئی، اسی طرح کھڑکی سے نکل کر لامتناہی فضاؤں میں گم ہوتے رہے اور میں سر پکڑ کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ آنکھیں شدت کرب سے دکھنے لگیں، سر بہت بھاری ہو گیا، کان سلگ اٹھے اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ آ گیا۔ اس وقت **Disprin** ٹیبلٹ میرے درد کی دوا بنی۔

ooo

26 جولائی ہندوستان کی عسکری تقریبات میں اہم دن ہے۔ پورے ملک کے طرز پر جے این یو میں بھی یہ دن منایا گیا اور اس شان سے کہ پہلے ممی ڈالاوی سی کی قیادت میں **24** سو میٹر کا ترنگا مارچ نکلا۔ وہ جلوس جن جن سڑکوں سے گزرا، ان میں ہر بیس میٹر پر **Tringa March** پینٹ کیا گیا۔ یہ جلوس جے این یو کی سڑکوں سے ہوتے ہوئے کنونشن سینٹر جے این یو کے مرکزی ہال میں پہنچا جہاں جنرل [ر] جی۔ دی نخشی کی صدارت میں ''کارگل ویرتا سمواد'' پروگرام منعقد ہوا۔ اس میں شرکت کی غرض سے جے این یو کے طلبا سمیت باہر سے بھی لوگ آئے۔ اس پروگرام میں ہندوستانی سابق سلامی بلے باز گوتم گمبھیر نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔

دوران تقریب بم و بارود کے سائیوں میں جینے والے فوجیوں نے اپنی گفتگو میں اس قدر گولہ باری کی کہ خدا کی پناہ۔ جے این یو کے ایوان تو ہلنے ہی لگے۔ جنرل [ر] جی۔ دی نخشی نے اپنی زہر خند آواز و انداز میں جے این یو جیسی پرامن جگہ پر خوب بمباری کی۔ پھر اس

بمباری میں مزید شدت لانے کے لیے **JNU VC** نے جے این یو ایڈمن پارک میں ''آرمی ٹینک'' لگانے کا مطالبہ کر دیا جس سے ان کے بقول یہاں کے طلبا میں 'دیش بھکتی' اور 'دیش پریم' کی بھاؤنائیں جاگ جائیں گی۔ اس مطالبے پر اسٹیج کے تمام شریکوں نے توجم کر تالیاں بجائیں تاہم سامنے بیٹھے طلبا حیرت وافسوس میں پڑ گئے۔ یہ وی۔سی نے کیا کہہ دیا۔ کیسا اور کس قسم کا مطالبہ کر دیا اور طلبا کو باتوں ہی باتوں میں کتنی بڑی گالی دے دی۔ یعنی جے این یو کے کلچر اور تہذیب کے منہ پر زوردار طمانچہ مار دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی دیش بھکتی اور حب الوطنی ایک بار پھر شک کے دائرے میں لا کھڑی کر دی گئی۔ حالاں کہ اس دوران جے این یو نار کوٹیسٹ، تہاڑ ٹیسٹ، پٹیالہ ہاؤس کورٹ ٹیسٹ، دہلی پولیس ٹیسٹ غرض ہر ٹیسٹ سے گزر چکا تھا، اس کے باوجود خود کو ملک کا مالک سمجھنے والا طبقہ، جے این یو کی جانب سے دل میں کدورت اور میل رکھے ہوئے تھا۔

**JNUVC** کا یہ مطالبہ جے این یو کی ساکھ [ گریما] پر یہ ایک اور حملہ تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کو آرمی کیمپ بنانا، کہاں تک درست تھا؟ کسی نظریے اور نیشن بلڈنگ کے ایک اہم ستون کو بے اعتبار سمجھ کر اسے بوٹوں، آہنی بیلٹوں اور ہلمیٹوں کا خوف دلانا کہاں، کی عقل مندی تھی؟

ان سوالات کو وسعت بیان اور سوچ فکر ملی تو انھوں نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ جے این یو ایس یو اور ملک کے سیکولر طبقات وحکومتوں کی جانب سے اس کی سخت الفاظ میں مخالفتیں ہونے لگیں۔ جے این یو میں ایک بار پھر بوال مچ گیا اور اسٹوڈنٹ، ہیومن چین بنانے، کینڈل مارچ نکالنے اور پروٹیسٹ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

افففف! جے این یو کو ایک اور مصیبت میں ڈال دیا گیا۔ جے این یو پھر اپنے دفاع کے لیے اسٹوڈنٹس کی جانب دیکھنے لگا اور طلبا اس کی آبرو پر قربان ہونے پر پھر آمادہ ہو گئے۔

www.urduchannel.in



ان حالات میں مجھے رہ رہ کر نوین کی یاد آتی تھی اور میں ہر جگہ انھیں پکار پکار کر کہتا تھا: ارے ڈوڈ! تم یہ کیا کہہ گئے، تمھیں کیسے یہ سب کچھ بہت پہلے پتا ہو گیا تھا، تم اتنے عقل مند کب اور کیسے تھے.....؟'' کیمپس سے روم آ کر بھی میں نے اس کے خالی بستر سے پوچھا تھا۔ مگر وہ جواب دینے کے بجائے مجھے ایسے گھور رہا تھا جیسے نوین گھورتا تھا، جب میں اس کے ہاتھ سے کتاب چھینتا تھا——

''—— انیس! دیکھ لو جے این یو برباد ہو گیا۔ جے این یو کی ساکھ اور نظریہ توڑ دیا گیا اور اب تو اس کی حب الوطنی بھی مخدوش ہو گئی۔ یہاں ٹینک لگے گا اور اگر نہیں لگا تو یہاں کی سوچ ٹینک کے دھماکوں کی سی ہو جائے گی۔'' روم میں بسی نوین کی سانسوں کا آہنگ کہہ رہا تھا اور میں کانوں پر ہاتھ رکھ کر ''بس کرو بس کر تمھاری باتیں مجھے جنرل (ر) جی۔ ڈی بخشی سے بھی زیادہ خوف ناک لگ رہی ہیں——''

مجھے ہول آنے لگا اور نوین کی سانسیں فاتحانہ قہقہے لگانے لگیں۔ ٹینک والے جے این یو کا تصور کر کے ہی دل کانپ کانپ گیا اور سر میں شدید دھماکے ہونے لگے۔ مجھے رہ رہ کر کنونشن سینٹر کے مرکزی ہال میں کہی گئی باتیں یاد آ رہی تھیں اور سانسیں سینے میں کسی بے خوف زدہ پرندے کی مانند پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ ماحول کسی ہیبت ناک ہیولے کی مانند میری جانب بڑھتا آ رہا تھا اور اعصاب قوت سے عاری ہوتے جا رہے تھے۔ پھر میں اپنے تمام وجود سمیت نامعلوم گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

○○○

## (9)

## یہ کیسی رسم چلی رے ـــــــ!

5 ستمبر **2017** کا سورج اپنا دن بھر کا سفر طے کر کے جے این یو کے پشچم آباد کے زون میں **Ambince Mall** کے عقب میں منہ چھپا رہا تھا، اچانک جے این یو میں ایک شور برپا ہوا۔ ایک بھیڑ تھی جو **''گوری لنکیش زندہ باد''۔ ''گوری ہم شرمندہ ہیں، تیرے قاتل زندہ ہیں''۔ ''گوری تیرے خوں کی قسم، نہیں بھولیں گے نہیں بھولیں گے''۔ ''گوری تم آدرش ہو، آدرش ہو آدرش ہو''** جیسے نعرے لگاتی ہوئی گزر رہی تھی، اس بھیڑ کی قیادت جے این یو ایس یو کر رہا تھا۔ میں اس بھیڑ کو بالکنی سے دیر تک دیکھتا رہا جو کشاں کشاں سابرمتی ڈھابے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر وہ بھیڑ حسب دستور ایک گول دائرے میں تبدیل ہو گئی، دو چار طلبا ''**Effigy Burning**'' کی جگہ آئے اور منو واد کا کے پتلے میں آگ لگا دی۔ پتلہ دھوں دھوں کر جل رہا تھا، فسطائت جل رہی تھی، اور ہمیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہماری روحوں کو تسکین مل رہی ہو۔

افوجی برن ہو رہی تھی اور مقرر کہہ رہا تھا کہ آج بنگلور میں سینئر صحافی اور سماجی کارکن گوری لنکیش کو دو موٹر سائیکل سواروں نے مغربی بنگلور میں واقع ان کے گھر کے باہر **7.65** ایم ایم کی دیسی پسٹل سے قتل کر دیا۔ وہ ''گوری لنکیش پتریکے'' نام کی ہفتہ وار میگزین کی مدیرہ

www.urduchannel.in



تھیں۔ اس میگزین میں حکومت اور فسطائی طاقتوں کے خلاف بے باکی سے لکھتی تھیں۔ ان کا قلم سماجی برائیوں اور معاشرے میں موجود فسطائی ذہنیت کے خلاف زبردست انداز میں لکھتا تھا۔ موجودہ سرکار کے بھکتوں کو ان کی بے باکی سے خوف آنے لگا، وہ سچ کا سامنا نہ کر سکے، وہ غریبوں کے لیے حق وانصاف کی آواز اٹھتے نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ انھوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ ایک آزاد اور جمہوری ملک میں اظہار رائے کی آزادی پر قدغن لگانے کا یہ چلن کیسا چلا رے۔

چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کر چلے!

یہ ملک میں کیسی رسم چلی ہے کہ حق گو اور سچ لکھنے والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ گوری لنکیش سے قبل ملیش اپا کلبرگی کو ان ہی وجوہات یعنی سچ گوئی وحق بیانی کی بنیادوں پر قتل کر دیا گیا ـــــــ''

وہ کہہ رہا تھا اور افوجی جل کر اب بجھ رہی ہے۔

''ـــــــ ہم گوری لنکیش کو یوں ہی نہیں مرنے دیں گے، وہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی، اور ہم ان کے آدرشوں کو اپنا رہ نما بنائیں گے۔ گوری لنکیش کے بعد اب ہم سب کی ذمے داری ہے کہ ملک وسماج کو بچانے کے لیے آگے آئیں، سچ لکھیں، سچ بولیں اور حق کی آواز اٹھائیں، اسی میں ان قاتلوں کی ہار ہے، گوری مرتے مرتے ہمیں حبیب جالبؔ کے الفاظ میں یہ پیغام دے گئیں:

دینا پڑے کچھ بھی ہرجانہ، سچ ہی لکھتے جانا!
مت گھبرانا مت ڈر جانا، سچ ہی لکھتے جانا!
باطل کی منہ زور ہوا سے جو نہ کبھی بجھ پائیں!
وہ شمعیں روشن کر جانا، سچ ہی لکھتے جانا!

اس نے جیسے ہی یہ انقلابی اشعار ختم کیے، چاروں طرف گوری لنکیش کی حمایت اور اس کے قاتلوں کی مخالفت میں نعرے لگنے لگے۔اس آئیڈیالوجی کو آڑے ہاتھوں لیا جانے لگا جس نے گوری لنکیش کے بدن میں گولیاں پیوست کی تھیں اور جو اسے کتیا اور اس کے غم پر بلبلانے والوں کو کتیا کے پلّے کہہ رہی تھی۔اس سوچ کے خلاف طلبا نعرے لگا رہے تھے جو حکومت اور پاور کے ذریعے ملک کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے تھی۔

اس موقع پر چند اور لوگوں نے بھی تقریریں کیں اور گوری لنکیش کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی دیگر خصوصیات سے حاضرین کو متعارف کرایا۔

یہ میٹنگ ختم ہوئی اور دوسرے دن سے بلکہ قتل کے دن سے ہی ٹویٹر ہینڈل سے گوری لنکیش اور ان کے ہم خیال وفکر لوگوں کے خلاف ٹویٹنگ شروع ہوگئی، ٹرولرز بہت خوش تھے اور جشن منا رہے تھے۔ان میں گجرات کے سورت شہر سے تعلق رکھنے والا ایک ٹرولر تو سب سے آگے بڑھ گیا۔اس کے ٹویٹ نے انسانیت کا سر ہی شرم سے جھکا دیا۔اس نے لکھا تھا کہ ''ایک کتیا کتّے کی موت کیا مری سارے پلّے ایک سُر میں بلبلا رہے ہیں۔'' نریندر مودی کا شمار اس کے فالورز میں ہوتا ہے۔اس سے قطع نظر اہم بات یہ ہے کہ فسطائی ٹولے کی طرف سے ایک مرنے والی اور ان کے لیے سولیڈیٹری رکھنے والوں کے لیے اس طرح کی بات کہنا، کہاں تک درست ہے؟ یہ سوال جتنا اہم ہے اس کا جواب بھی اتنا ہی اہم ہے مگر سوال تو موجود ہے اور جواب ندارد۔

گوری لنکیش کے بہیمانہ قتل نے پورے جے این یو کو سوگوار کر دیا۔اسے ایسا لگا جیسے اس کی آواز دبا دی گئی اور اس کا گلہ گھونٹ دیا گیا۔جے این یو لوجی سارے جہاں کے درد کو اپنا درد مانتی ہے اور اسے ایسے ہی محسوس کرتی ہے جیسے خود اس کے سینے میں اٹھا ہو۔

www.urduchannel.in



جے این یو پر وہ ایام بہت ہی مشکل گزر رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ حق بیانی اور حق گوئی کے مرکز جے این یو کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔اسی طرح جے این یو مزاج کے طلبا واساتذہ کے مونہوں پر تالے ڈالنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔جے این یو اس وقت اس طرح تڑپ رہا تھا جیسے کسی کو قتل کرنے کے لیے دبوچ لیا جاتا ہے اور وہ قاتلوں سے بچ نکلنے کے لیے تڑپتا ہوا ہاتھ پیر پھینکتا ہے۔جے این یو وسیع تناظر میں سوچ رہا تھا، اسے اپنے مفاد سے زیادہ ملک کا مفاد عزیز تھا۔اس کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ جے این یو اپنے لیے سوچتے وقت ملک وسماج کے لیے زیادہ سوچتا ہے۔

بس یہی بات زمانے کو بری لگتی ہے

اور زمانہ اس کی سزا جے این یو کو بہت سخت دیتا ہے۔

ooo

ابھی جے این یو ان چھوٹے بڑے حالات کی چوٹوں اور ان کے ذریعے لگنے والے زخموں سے اُبر ہی رہا تھا کہ **JNUVC** نے جے این یو کی تاریخ میں سیاہ حروف سے لکھے جانے والا سب سے مہیب فرمان جاری کر دیا **Compulsory Attendance** یہ فرمان اس قدر اچانک اور غیر متوقع طور پر آیا کہ جے این یو ایس یو اور عام جے این یو اسٹوڈنٹ تلملا اٹھے۔دراصل ان کی آزادی اور لبرٹی کی بات آ گئی تھی۔دوسری بات جو ہوش وحواس میں محسوس کی گئی، وہ جے این یو کا آئین تھا، جس میں روز اول سے ہی یہ بات تھی کہ ''پارلیمنٹ ایکٹ کے تحت **1969** میں نئی دہلی میں ایک ایسی مرکزی ریسرچ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں لازمی حاضری کے بغیر تعلیم کا انتظام ہو۔'' اسی طرح جے این یو کو ایک نظریے کا اور قومی تعمیر کا ایک مضبوط ستون بھی قرار دیا گیا۔چنانچہ

پنڈت نہرو نے اپنے 1963 کے ایک خط میں لکھا تھا:

''جے این یو صرف ایک تعلیم گاہ نہیں ہے بلکہ یہ ملک وقوم کے ایوان کا ایک ایسا ستون ہے جس سے جمہوریت، انسانیت، ملکی اتحاد، تعمیر وترقی اور مضبوطی کے خواب جڑے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اس کی بنیادوں اور مقاصد سے کھلواڑ کرے گا وہ راست ملک کی رگ و جاں سے کھیلے گا۔ حالاں کہ ملک میں متعدد اعلیٰ تعلیم کے ادارے موجود ہیں مگر جے این یو ان سب سے الگ اس فکر کا نام ہے جسے اگر میں ملک کی روح کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مختصر یہ کہ جے این یو ایک دانش گاہ نہیں بلکہ ایک نظریے کا نام ہے۔''

Compulsory Attendance کے اس فرمان نے اس یونیورسٹی قیام کے اس رول کو پامال کر دیا۔ چنانچہ جے این یو کی بنیادوں کے حامی طلبا سڑکوں پر آ گئے اور ''رول بیک، رول بیک، رول بیک اٹینڈینس'' کے نعرے لگانے لگے۔ ''نہیں سہیں گے نہیں سہیں گے، یہ فرمان نہیں سہیں گے''۔ ''جگو وی سی نہیں چلے گی، تیری کوشش نہیں چلے گی''۔ ''We Want University, Not An Interprise''۔ ''ممی ڈالا، کیا کر ڈالا، ممی ڈالا کیا کر ڈالا ـــــ'' ایسے کتنے ہی نعرے تھے، جو جے این یو کی فضاؤں میں ایک بار پھر سریلے آہنگ وترنگ کے ساتھ گونجنے لگے۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ گریجویشن اور ماسٹرس تک تو حاضری کا لزوم درست ہے مگر ایم فل، پی ایچ ڈی اور ریسرچ کے دیگر اسٹوڈنٹ کے لیے حاضری کا لزوم چہ معنی دارد ـــــ؟ مگر JNUVC اور ان کے ہم نواؤں نے طلبا کے ان نعروں اور احتجاجی مظاہروں کی سخت الفاظ اور انداز میں مخالفت کی اور احتجاجی طلبا کے خلاف نوٹس بازی، فائن، اخراج کی دھمکیوں کا دور شروع ہو گیا۔ اس عتاب کی زد میں آنے والے طلبا نے اس کا بھرپور دفاع کیا مگر، افسوس انھیں بہت کم حمایتیں ملیں نتیجتاً ان کی مہم دم



توڑ گئی۔ اسی موقع کا VC ممی ڈالا اور ان کے ہم نواؤں نے بھرپور فائدہ اٹھایا پروپوزل کے طور پر پیش کیے جانے والے ''Compulsory Attendance'' فارمولے کو حقیقی طور پر 22 جنوری 2018 سے نافذ کر دیا گیا۔ اس دن طلبا ایک بار پھر سیخ پا ہوئے اور یونیورسٹی اسٹرائیک چھیڑ دی۔ اسکول بند کر دیے اور اساتذہ وطلبا کا داخلہ بند کر دیا۔

2016-2017 اور رواں برس، جے این یو کے ایسے سال ہیں جن کے ایام تعلیم سے زیادہ سیاست اور احتجاج کی نذر ہوئے۔ ABVP اور VC کا ''شٹ ڈاؤن جے این یو'' کا مشترکہ نعرہ سچ ثابت ہونے لگا۔

ان ہی دنوں ملک کی متعدد ریاستوں میں لوک سبھا ضمنی انتخابات ہوئے جن میں حکمران جماعت بی جے پی کو کراری شکست ملی، اس نے بھارتیہ جنتا پارٹی کی بڑھتی شر پسندیوں اور حکومت کے ارادوں پر کچھ دیر کے لیے بندش لگا دی۔ مگر چالاک لوگوں اور پالیسی سازوں نے ملک کو دوسرے معاملوں میں الجھا دیا۔ ان ہی دنوں خبر آئی کہ عراق میں ISIS کے قبضے میں پھنسے 29 ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ حکومت نے بھی ان کی ہلاکت کی تصدیق کر دی۔ اس پر پارلیمنٹ اور دیگر عوامی مقامات پر بے تحاشا احتجاج اور مظاہرہ ہوا مگر موقع شناس حکومت نے ''فیس بک ڈاٹا چوری'' کا نیا شاخسانہ چھیڑ کر فیس بک انتظامیہ کے مالک مسٹر زکر برگ کے خلاف نوٹس جاری کر دیے۔ جس کے بعد ہندوستانی عوام اور بے دار طبقہ ''فیس بک ڈاٹا کی چوری اور اس کے تحفظ'' کے تئیں فکر مند ہو گیا اور 29 بدنصیب جانیں سرد خانے کی شکار ہو گئیں۔ لاشوں پر سیاست کی مثال ایک بار پھر ہمارے سامنے آ گئی اور ملک ترقی کرتا رہا۔

○○○

www.urduchannel.in

ملک میں یہ حالات تھے اور جے این یو میں ایک پروفیسر کے خلاف 8 ایف آئی آر درج ہو رہی تھیں ۔ پروفیسر انل جوہری پر ان کے سپرویژن میں شامل کچھ طالبات نے جنسی ہراسانی کا کیس درج کرا دیا۔ جس کے بعد سے پورا کیمپس ایک بار پھر نعروں اور احتجاجی سروں سے سلگ اٹھا۔ طلبا پلے کارڈ اور بینر اٹھا کر پروفیسر کی معطّلی اور گرفتاری کا مطالبہ کر رہے تھے مگر جے این یو انتظامیہ اور JNUVC مسلسل خاموش اور موصوف کی پشت پناہی میں مصروف تھے۔ ان حالات نے طلبا کی مومنٹ کے شعلوں کو اور بھڑکا دیا، جس کے بعد دلی پولیس کے چند اہلکاروں نے انل جوہری کو ان کے آفیشیل چیمبر میں علامتی طور پر گرفتاری کے بعد ضمانت دے دی۔ مگر طلبا اس سے بھی زیادہ کچھ اور کا مطالبہ کر رہے تھے ،اس بار ان کے شانہ بشانہ JNUTA بھی تھا اور مظلوم طالبات کے لیے انصاف کی آواز لگا رہا تھا مگر ان تمام مطالبات کو انتہائی سختی اور نخوت سے دھتکار دیا گیا مگر سرفروش طلبا اور اساتذہ اب آر پار کی جنگ کے لیے کمر بستہ ہو چکے تھے۔ اس بار انھوں نے جے این یو کی سڑکوں، چوک چوراہوں اور عام گزرگاہوں پر سفید پینٹ سے لکھنا شروع کر دیا **Stop Down Jauhari LAMA, Suspended Jauhari LAMA,Down Down Jauhari LAMA** پھر یہ سلوگنس یا نعرے جے این یو کی فضاؤں میں بھی گونجنے لگے اور جوہری لاما اپنے ریسیڈینس میں کسی چوہے کی مانند چھپ گیا۔

○○○

تعلیم اور بے داری کو ایک بار پھر حکومت کی بدنظر لگ گئی، ایک دن وزیر تعلیم نے پری پلاننگ کے بغیر ہی ''جے این یو'' سمیت ملک کی چند دیگر بڑی یونیورسٹیوں کو ''اٹانومس''



زمرے میں شامل کر دیا۔ یعنی اب جے این یو اور ان سب اداروں کے منتظمین اپنے فیصلے لینے، حکم نامے صادر کرنے، تعلیمی اصلاحات و فروغ، نئے کورسس کے آغاز، طلبا کی تعداد میں کمی و زیادتی اور ان کی تعلیمی فیس کی وصولی کے لیے خود مختار ہیں۔ وہ جیسے چاہیں ان اداروں کو چلا سکتے ہیں، نیز انھیں UGC سے کسی بھی طرح کی اجازت لینے یا جواب دہی کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری جانب وی سی نے اپنے اپنے سینٹروں میں ''لازی حاضری'' کی پابندی نہ کرنے والے چیئر پرسنس اور ڈین آف اسکولس کا غیر منطقی اور غیر اصولی طور پر تبادلہ کر دیا۔ جس سے جے این یو ٹی اے بھڑک گیا۔ چنانچہ وی سی کے فرمان اور عزت مآب وزیر تعلیم کے مذکورہ اعلان نے ملک کے سیکولر اور تعلیم دوست طبقے کو ایک بار پھر سڑکوں پر آنے کو مجبور کر دیا۔ ان کی دور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اب جے این یو جیسے اداروں کے دروازے غریبوں اور متوسط طبقات کے بچوں کے لیے بند ہو جائیں گے، جے این یو کی عام تعلیم اب مخصوص اور محدود ہو کر رہ جائے گی اور ایک معمولی حیثیت کا طالب علم اپنے اعلا تعلیم کے حصول کے خوابوں کا خود ہی گلا گھونٹ دے گا—— چنانچہ اساتذہ اور طلبا وہ اپنے ان اندیشوں اور خدشات کے اظہار کے لیے **23** مارچ **2018** کو **''لانگ مارچ جے این یو ٹو پارلیمنٹ ہاؤس''** کی کال دے کر کیمپس سے باہر آ گئے۔ ابھی انھوں نے مشکل سے چھے سات کلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا کہ دلّی پولیس واٹر کینن کی بوچھار اور لات، گھونسوں، تھپڑوں کے ساتھ ان کی راہ میں حائل ہو گئی۔ ایسٹ قدوائی نگر اور آئی این اے مارکیٹ کا مشرقی حصہ پولیس کی اس بربریت کا گواہ ہے جس میں انھوں نے نہتے اور پرامن احتجاجی طالبات اور طلبہ کے کپڑے تک پھاڑ دیے، ان کے جسموں پر لاٹھیاں برسائیں اور انھیں شرمناک

www.urduchannel.in

گالیاں دیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے دو دشمن ملکوں کی فوجیں آپس میں لڑ پڑی ہوں۔ اپنا حق مانگنے والوں یا اپنے لیے انصاف مانگنے والوں کا یہ حشر ہوتا ہے یا ہوگا!؟ اس کا اندازہ شاید ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے والوں کو بھی نہ ہوگا، مگر افسوس، اب ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا اور ملک ہندوستان چیل کوؤں کے تصرف میں ہے۔

احتجاج اور مظاہرے کی مدت پوری کر کے تھکا ماندہ جب روم پر پہنچا تو نوین کا خالی بستر مجھے گھور رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میری حالت پر ہنسنے لگا اور پھر باقاعدہ اس نے فقرے بازی شروع کردی۔

''ـــــ انیس! تمھارا غم میرا بھی غم ہے، بلکہ میں تمام بچوں کے غم میں شریک ہوں ،انل جوہری اور وی سی کے جرم سے مجھے بھی نفرت ہے۔ پولیس کی جانب دار کارروائی سے مجھے بھی شکوہ ہے۔ مگر ایک حقیقت تم جان لو، وہ یہ اب جے این یو، جے این یو ایس یو، یہاں کے عام طلبا اور یہاں کے ٹیچروں کو جھکنا ہی پڑے گا، ورنہ جے این یو بچ نہیں سکتا، دشمنوں کا اسے بند کرنے کا سپنا سچ ثابت ہوجائے گا۔ نہ تم سمجھ رہے ہو، نہ جے این یو ایس یو کے نعرے باز سمجھ رہے ہیں اور حیرت ہے کہ یہاں کے ٹیچر بھی یہ بات نہیں سمجھتے۔ تم دیکھو، جیسے ابھی پولیس نے لانگ مارچ میں لاٹھی چارج کیا ہے، لڑکیوں کے کپڑے پھاڑے ہیں، لڑکوں کے لاٹھیاں اور ڈنڈے مارے ہیں، یہ کیا ہے؟ کیا پولیس سے مقابلہ کرنا آسان ہے، جو کسی بھی ملک کی سب سے پاورفل باڈی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ سرکاریں بھی انھیں ہی پروٹیکشن دیتی ہیں۔''

نوین کہہ رہا تھا اور میں سر پکڑ کر اس کی باتیں سنتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ سب باتیں اسے کیسے معلوم تھیں یا وہ محسوس کرتا تھا۔ وہ جے این یو میں بھی نہیں تھا مگر جے این یو کے پل پل

www.urduchannel.in



سے آگاہ تھا۔

دہلی کی سڑکوں پر دلّی پولیس کے ڈنڈوں، لات گھونسوں اور گالیوں کی مار کھا کر جے این یو ایس یو، جے این یو ٹی اے اور جے این یو کے عام طلبا و اساتذہ واپس آگئے اور اپنے زخموں کو سہلانے لگے۔ کیمپس میں آ کر پریس کانفرنسیں کرنے لگے اور وی سی سے اسپیکٹ کرنے لگے کہ وہ دلّی پولیس کی اس بہیمانہ اور شرمناک کارروائی پر معافی مانگے اور اپنی اخلاقی ذمے داری قبول کرے۔ دلّی پولیس کی سرزنش کرے اور اس کی شکایت اعلا حکام و ارباب حل و عقد تک کرے۔ تاہم ان کی یہ امیدیں اور یہ توقعات لاحاصل تھیں۔ وی سی کا ہے کو یہ سب کریں گے یا کرتے، انھیں تو اس وقت دلی سکون حاصل ہو رہا تھا جب دلّی پولیس طلبا و طالبات پر ڈنڈے، لات گھونسے چلاتے وقت ان کے کپڑے بھی تار تار کر رہی تھی اور انھیں گالیاں دے رہی تھی۔ **JNUVC** کی مرادیں بر آ رہی تھیں اس وقت اور وہ دلّی سے باہر یا اندر ہی چین کی بانسری بجا رہا تھا۔ ممی ڈالا کا ایسا رخ خدا ہمیں خواب میں بھی نہ دکھائے جو ہم جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس سخت جان کو ہمارے زخمی جسم، کٹے پھٹے کپڑے اور دلّی پولیس کے خونخوار و ناپاک ارادوں سے بال بال بچ جانے والی ہماری عصمتیں دکھائی ہی نہیں دے رہی تھیں۔ چنانچہ انصاف اور حصول حقوق کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں۔ جے این یو کی چھاتی پر نئے نئے اور سخت قوانین کے ذریعے مونگیں دلنی شروع ہوگئیں۔

○○○

## (10)

## —— *SHUT DOWN SHUT DOWN JNU*

میں ایک دن تیز دھوپ اور امس بھرے ماحول سے بچنے کے لیے کمرہ نمبر 259 میں آرام کر رہا تھا۔ کھیتان کا پنکھا دو نمبر پر چل رہا تھا۔ ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ پشچم آباد کے سب سے آخری ہاسٹل چندر بھاگا سے جے این یو کیمپس میں لگنے والے روایتی نعروں کا شور سنائی دیا۔

**''آواز دو—— ہم ایک ہیں!''**

**''نوٹس ووٹس نہیں چلے گا—— نہیں چلے گا نہیں چلے گا!''**

**''سارے فرمان واپس لو—— واپس لو، واپس لو!''**

**''جے این یو وی سی مردہ باد—— مردہ باد، مردہ باد!''**

**''جے این یو ہے اسٹوڈنٹس کا—— وی سی کی جاگیر نہیں ہے!''**

**''دلّی پولیس مردہ باد—— مردہ باد، مردہ باد!''**

**''واپس جاؤ، واپس جاؤ—— دلّی پولیس واپس جاؤ!''**

**''جے این یو وی سی شرم کرو— شرم کر، شرم کرو!''**

**''ہماری مانگیں پوری کرو— پوری کرو، پوری کرو!''**

www.urduchannel.in



**شرم نہیں تو ڈوب مرو— ڈوب مرو، ڈوب مرو!''**

**''آج بھی یونیورسٹی بند ہے—— بند ہے، بند ہے!''**

**''کل بھی یونیورسٹی بند رہے گی—— بند رہے گی بند رہے گی!''**

**''جب تک ہماری بات نہ مانی جائے گی، بند رہے گی—— بند رہے گی، بند رہے گی!''**

یہ نعرے جے این یو کی جلتی دوپہر میں ایک کربناک فضا بنا رہے تھے۔ آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور جوش ایسا تھا الاماں جیسے خس و خاشاک کو بہا لے جائے گا۔ یہ قافلہ ہمارے ہاسٹل کے سامنے سے گزرتا ہوا سابرمتی ڈھابہ پہنچا جہاں دن دہاڑے وی سی اور دلّی پولیس کے علامتی پتلے نذر آتش کیے۔ پتلے دھوں دھوں کر جل رہے تھے۔ اس آنچ کی شدت اس گرم ماحول کو اور زیادہ گرم کر رہی تھی۔ اول تو موسم گرم، دوم طلبا بھڑکے ہوئے، سوم پتلے بلکہ نفرت کا پتلے جل رہے تھے۔ ان پتلوں کو جلتا دیکھ کر طلبا پرجوش انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ جیسے ہی یہ پتلے خاکستر ہوئے، اسی وقت اس بھیڑ سے ایک کامریڈ نکلا اور اس تمام احتجاج اور افوجیز برننگ کا تعارف و روداد بتانے لگا۔

''—— ساتھیو! انقلاب زندہ باد.....

''—— جیسا آپ سب کو معلوم ہے ''لانگ مارچ'' کی ناکامی کے بعد جس طرح وی سی اور جے این یو انتظامیہ کی سردمہری نے ہمارے زخموں پر نمک چھڑکا ہے اس سے ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم رنگ روڈ کے احاطے میں واقع تمام اہم اسکولوں کے مین گیٹ بند کر دیں، ان میں دہرے تہرے تالے جڑ دیں، جس سے جے این یو کا آفیشیل کام کاج پوری طرح ٹھپ ہو جائے۔ ہم وہاں دھرنا دے کر بھی بیٹھیں۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور دو چار روز تو جیسے تیسے یہ چلا، پانچویں چھٹے دن دلّی پولیس کی ایک وین آئی اور ایک

اسکول کو زبردستی کھلوادیا۔اس مزاحمت میں دس بارہ اسٹوڈنٹ زخمی ہوگئے جن میں ہماری گرلز ساتھی بھی شامل تھیں۔ پولیس کی یہ کارروائی دیکھ کر ہم کی ایک بھاری سنکھیا (تعداد) وہاں آ گئی اور دلّی پولیس کے خلاف نعرے بازی شروع کردی۔دلّی پولیس بوکھلا کر وہاں سے اسی حالت میں چلی آئی۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہم نے پورے کیمپس کو خبردار کرنے کے لیے ہنگامی میٹنگ کی اور پھر دلّی پولیس، وی سی اور جے این یو انتظامیہ کے خلاف ریلی اور مارچ شروع کردیا۔

ساتھیو! وی سی اور دلّی پولیس کا یہ اٹیک ہم کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے۔اب جب تک ہمارے مطالبات پورے نہیں ہوجاتے، جے این یو اسی حالت پر رہے گا۔ہم جے این یو اور یہاں کے کامن اسٹوڈینٹس کا گلا گھونٹتے نہیں دیکھ سکتے، ٹیچرس کا کریئر برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے.....''

ابھی یہ باتیں جاری ہی تھیں کہ دوسری جانب سے وی سی کے ہم نوا ٹیچرس اور اسٹوڈینٹس نعرے لگاتے آئے ان کے ہاتھوں میں بھگوا کلر کا جھنڈا پھیرا رہا تھا اور سر پر اسی رنگ کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں:

**''جھولا چھاپو! کیمپس چھوڑو------- کیمپس چھوڑو، کیمپس چھوڑو!''**

**''وی سی کے ہتھیارو، کیمپس چھوڑو--------- کیمپس چھوڑو، کیمپس چھوڑو!''**

**''ہم کو پڑھنا ہے، ہم کو پڑھنے دو--------- ہم کو پڑھنے دو!''**

**''لینن کے کتو باہر جاؤ--- باہر جاؤ، باہر جاؤ!''**

**''ارے نکسل وادہو برباد دو--- ہو برباد، ہو برباد!''**

اس طرح کے نعرے لگاتے ہوئے یہ گروہ بھی سابرمتی ڈھابہ پہنچ گیا۔ یہاں آ کر

www.urduchannel.in



جانبین میں جنگ کا سا ماحول بن گیا، پھر قریب تھا کہ جے این یو کے طلبا آپس میں ہی لڑ پڑتے، وہ تو کہیے کہ **G4S** کے گارڈ درمیان میں آ گئے۔ مشتعل ہجوم کسی بپھرے طوفان کی مانند دوسری جانب مڑ گیا اور ایک بڑا حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔اس واقعے کا میرے دل پر خاص اثر ہوا۔ میں نے اپنے جے این یو کے قیام میں کبھی اس قسم کی صورت حال نہیں دیکھی تھی۔ یا اللہ یہ کیا ہونے جا رہا تھا۔ میں نے شدت کرب سے سر تھام لیا اور اسی حالت میں خراماں خراماں اپنے کمرے پر آ گیا۔میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔اب مجھے نوین کے بستر سے بھی انھیں ملانے کی تاب نہ تھی۔ میرے وجود میں کتنے ہی شعلے اور طوفان بلند بلند ہو کر دب رہے تھے۔ کتنے ہی کرب زبان درد مانگ رہے تھے اور کتنے ہی صدمے آہ کے طالب تھے۔اچانک فضا میں نوین کے قہقہے بلند ہوئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے چھت پھٹ پڑے گی۔ پھر ان قہقہوں کے درمیان سے آواز بلند ہوئی——:

''اب.....''

''بس ....بس!'' میں نے اس آواز کو سختی سے دبانا چاہا مگر مجھے اپنی آواز کا کھوکھلا پن صاف نظر آ گیا۔

''مجھے تو چپ کردو گے مگر اب تو ان حالات کا گواہ جے این یو چپہ چپہ ہو چکا ہے!'' وہ کہنے لگا ''اسے کیسے چپ کراؤ گے، انیس! رات میں کیے جانے والے گناہ اور برائیاں تو چھپ سکتے ہیں مگر دن میں تو اندھوں کو بھی نظر آ جاتا ہے اور وہ چشم دید گواہ بن جاتے ہیں، تم کس کس کو چپ کراؤ گے اور کس کس سے کہو گے کہ نہیں جے این یو ابھی پہلے جیسا ہے، میری بات ماننے میں ہی بھلائی ہے، اب مان بھی لو جے این یو برباد ہو گیا، جے این یو بدل گیا، جے این یو میں سیکولرزم اور بھائی چارے کی گائے ذبح ہوگئی اور اس فرشتے کو گولی

ماردی گئی جو یہاں امن کا پیامبر تھا۔تف ہے تم پر اگر تم نے نجیب کا دردناک واقعہ اور حادثہ دیکھ کر بھی جے این یو کی بربادی اور اس کی قدروں کی پامالی کا اندازہ نہیں کیا تو! اتنے سارے حالات رونما ہونے کے باوجود بھی اگر تم جے این یو کے اس سینس میں دیکھتے ہو، جو اس کی اصل بنیاد تھے، تو تم سے بڑا کور چشم کوئی اور نہیں ہوسکتا.....''

نوین کسی ریکارڈ کی مانند کہتا ہی جارہا تھا اور میں کبھی سر تھام کر، کبھی پہلو بدل کر، کبھی چیں بہ جبیں ہوکر اور کبھی کربناک گہری سانس لے کر اس کی ''وانی'' سن رہا تھا۔

پہلے پہل تو یہ باتیں مجھے معمولی لگیں، پھر بتدریج ہلکے ہلکے کنکر بن کر چبھنے لگیں، پھر تو ہوتے ہوتے انھوں نے تیز ہتھوڑوں اور موگروں کی شکل اختیار کر لی، میرا دماغ جیسے پھٹنے لگا، میں نے شدت کرب سے آنکھیں بند کرلیں اور نہایت سختی سے دونوں ہاتھوں سے سر بھینچ کر کانوں کو بند کرلیا۔اب مجھے نوین کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔میں اسی عالم میں سو گیا۔ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میں ایک خوابستان میں پہنچ گیا۔

خوشگوار ماحول میں ایک پرفضا مقام پر اسٹیج لگا تھا، ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسٹیج کے سامنے لگے پنڈال میں بیٹھے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔اچانک اسٹیج کی دائیں جانب سے ایک دبلا پتلا سا آدمی نکلا۔قریب آنے پر میں نے اسے اچھی طرح پہچان لیا، وہ ہمارے جے این یو کا وی سی ممی ڈالا ایم جگدیش کمار تھا۔

اس نے آتے ہی مائک سنبھالا اور روایتی انداز میں کھنکار کر بولا شروع کیا:

''—ام بوت پریشان اے۔ام جب جے این یو آیا تو سوچا کی ام اس انسٹی ٹیوٹ کو آکاس کی اونچائی پر لے جاؤں گا، لیکن ام کیا کروں، یہاں کا اسٹوڈینٹ کمیونٹی نے کبھی امارا سیوگ نہیں کیا، ام نے لاک بار سوچا کہ ام یہاں کے ٹیچرس کو بی بوت عزت دے گا

www.urduchannel.in



پر نتو ان اماری بات نئیں مانا، ام کیا کروں، ام بوت پریسان اوں، اب اسکول بند او گئے، اسٹوڈنٹ ہی پڑنا نہیں چاتا، وہ اسٹرائیک کررا اے، اس لیے اب ام نے سوچا اے جے این یو کو شٹ ڈاؤن کر دیا جائے.....''

وی سی اب یہاں تک پہنچے ہی تھے کہ میری آنکھ کھل گئی اور میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا اور سر ویسا کا ویسا ہی بھاری بھاری تھا۔نے پھر شدت سے سر پکڑ لیا۔ارے، ظالم کے یہ ارادے ہیں، اب جے اس نے جے این یو کو شٹ ڈاؤن کرنے کی پلاننگ شروع کر دی۔معا مجھے یہ خیال آیا کہ اس وی سی کے آتے ہی اے بی وی پی نے ''شٹ ڈاؤن جے این یو'' کا نعرہ دیا تھا۔وی سی نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی، کہیں یہ منصوبہ بندی اسی نعرے کی تکمیل کی جانب پیش رفت تو نہیں تھی.... یہ خیال آتے ہی میری روح جھنجھنا اٹھی۔ یا اللہ یہ کیسے دن اور کیسی راتیں ہیں، یہ کیسے ایام ہیں، یہ عبرت کے ایام ہیں مکافات عمل کے دن ہیں۔میں اسی عالم میں اٹھ بیٹھا اور سیدھا واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔جس سے چہرے اور باہری وجود پر تو سرد ہو گیا مگر میرا اندرون کسی تندور کی مانند جل رہا تھا، جگر، گردے، لہو، رگیں بلکہ میرے وجود کا تمام نظام انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ میرے سامنے جے این یو کی کشتی مہیب طوفانوں کی جانب بڑھ رہی تھی، جس کا ناخدا جے ین یو کا وی سی تھا جس نے حلف وائس چانسلری اٹھاتے وقت اس کی ہمہ طور حفاظت اور اس کی تقدس کی پاسداری کی قسمیں کھائی ہوں گی۔

○○○

جے این یو ان دنوں کو کبھی نہیں بھول سکتا جب ایڈمن اور اسکول کے آفشیل ورکس کی بندش کے زمانے میں، کلاسز نئی بلڈنگوں کی کار پارکنگس میں چل رہی تھیں۔وہ ٹیچرس جو کبھی ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتے، وہ ان ہی پارکنگس میں کلاس لے رہے تھے اور اسٹوڈنٹس

زمین پر بیٹھے ان لیکچرس کو سن یا لکھ رہے تھے۔ ان دنوں جے این یو کشاں کشاں اپنی بربادیوں کی جانب بڑھ رہا تھا اور اس کے درو دیوار آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وقت کان لگا کر سن رہا تھا۔ دیواریں ایک دوسری سے دکھ درد بانٹ رہی تھیں، انتظامیہ کی سختی اور طلبا کی بے بسی ان کا موضوع سخن تھا، تعلیم کے مسئلے سے زیادہ انھیں اپنے وجود کی فکر تھی، اپنے مابعد قتل ماتم کے لیے وہ رِدَم اور رَس تلاش کر رہی تھیں۔ نوحہ گر تو شاید انھیں مل جائیں مگر یا دفنانے والے بھی ملیں گے کہ نہیں، اس کے لیے انھوں کے کیمپس کے درختوں سے باتیں کرنی شروع کر دیں، درخت خود تحفظ کی تلاش میں تھے۔ انھیں بھی اپنا وجود ہی خطرے میں لگ رہا تھا، اپنی شوخ ہریالی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اسے چھپا رہے ہیں، خزاں کے بعد یہ چنچل و شوخ ہریالی انھیں پہلی بار بری لگ رہی ہے، ان کا عالم وہی تھا جیسے غدر یا افراتفری کے دنوں میں کوئی ماں اپنی نئی نئی جوان بیٹی کو چھپاتی ہے اور اس کو اس کے بے قرار و بے مہار جوبن کو سختی سے چھپانے کے لیے کہتی ہے یا خود ہی اس پر امر بیل کی مانند چھا جاتی ہے۔ حالاں کہ عام دنوں میں وہی ماں اسی بیٹی پر نازاں اور شاداں ہوتی ہے۔ جے این یو اب اپنے آپ میں ہی سمٹ رہا ہے، اس کے لیے خود اس کا پیرہن، اس کے لیے تنگ ہو رہا ہے، اس کی زبان کاٹ دی گئی۔ اس کے الفاظ و احساسات اس کے گلے میں ہی گھونٹ دیے، آنکھوں سے بھی نور چھین لیا جس کے ذریعے وہ اشاروں میں ہی اظہار درد کر تا یا کرب کے دو چار آنسو ہی گراتا۔ اس کے وہ لب چھیل دیے گئے جو آزاد تھے، جو ہلتے تو عرض مدعا بیاں کرتے اور حاصل فریاد لاتے۔ جے این یو کو پابند کر دیا گیا۔ اس کی بہاروں پر پہرے بٹھا دیے گئے، اس کے قد کو کترنا شروع کر دیا گیا۔ پتا نہیں اب یہ اس کی کترن کہاں تک جائے گی، کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے زمین میں ہی ملا دیا جائے۔ ہائے جے این یو، وائے جے این یو، تیرا خدا ہی حافظ، تیرا خدا ہی نگہ بان۔

OOO

آج کے اخبارات میں **NAAC** کی جانب سے ملک بھر کی یونیورسٹیز کی درجہ بندی

www.urduchannel.in



کی فہرست شائع ہوئی، جے این یو ملک بھر کے اداروں میں حسب معمول دوسرے نمبر پر آیا اور دہلی بھر کے اداروں میں اس کا نمبر چھٹا تھا۔ اس کام یابی پر وی سی نے جے این یو ٹی اے کی ہنگامی میٹنگ بلائی اور منی ایڈمن کنونشن سینٹر میں اسے سلبریٹ کیا۔ اپنے بیس منٹ کے خطاب میں جو انھوں نے کہا اس کا خلاصا بس یہ تھا:

''——ام جے این یو کو جاں لے جانا چاتا، بگوان کی کرپا سے او، واں پونچ راائے، ام نے جے این یو کے لیے کبی گلت نئیں سوجا، بٹ آئی ڈونٹ نو وائے اسٹوڈینٹ کمیونٹی اینڈ جے این یو ایس یو نوٹ سٹسفائیڈ، واہاٹ ایور، بٹ آئی ڈونٹ کیئر، ام کو کوئی پروائیں، ام اپنا مشن میں سچا ائے، ام جے این یو کو ہورا اوپر لے کر جائے گا۔

''——جے این یو امارا ڈیوٹی ائے، امارا ایمان ائے، امارا وژن ائے، ام نے جے این یو کو اپنا بیٹی مانا ائے، ام اس کا رکشا ایسا ای کرنا، ام کو اس کو ب سورت کیمپس سے بوت پیارا ائے، اسٹوڈینٹ ام کو بوت پیارا ائے، ان کا سکشا، ان کا ویلفیئر میں ام کوئی کمی نئیں کرے گا۔ اٹس مائی مورل اینڈ ایڈمنسٹریٹیو ڈیوٹی——''

وی سی کی اس ٹوٹی پھوٹی ہندی اور درمیان میں انگلش کے اندراج پر وہاں موجود لوگ زبرستی ہنسی بھی روک رہے تھے اور ٹیبل/ڈیسک بھی بجا رہے تھے۔ خدا خدا کر کے اس کی تقریر دل پذیر ختم ہوئی اور پھر پروگرام آرگنائزر نے پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔ اوڈی کے باہر چائے، چپس، اسنیک اور موتی چور کے لڈوؤں کا انتظام تھا۔ وی سی باب الداخلہ سے نکل اپنی سرکاری گاڑی میں بیٹھ کر ایسٹ گیٹ واقع اپنے ریسڈینس کے لیے روانہ ہو گئے اور یہ مجمع بچھڑ گیا۔ مگر کچھ سوالات وہیں رہ گئے تھے۔ کیا **NAAC** کی یہ درجہ بندی جے این یو کا مقدر سنوار دے گی؟ کیا جے این یو کا بگڑا مزاج اس سے درست ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کیا جے این یو کی موجودہ صورت حال میں اس سے بہتری آ سکتی ہے؟ کیا

واقعی اس کے بعد جے این یو کے نظام، انتظامیہ اور طلبا میں صلح ہوسکتی ہے؟ یہ سوالات وہیں بکھرے بکھرے اپنا جواب تلاش کررہے تھے، وہیں ٹھوکروں میں کچلے جارہے تھے مگر جواب دینے والے ان جوابوں کو اپنے سوٹ بوٹس میں لے کر چلے گئے۔ جے این یو کیمپس میں اٹھنے والے سوالات میں پھر اضافہ ہوگیا۔

جس وقت **JNUVC** اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں مافی الضمیر کی ادائیگی کررہے تھے، اسی وقت کنونشن سینٹر کے پارک میں طلبا **"جے این یو وی سی مردہ باد"** کے نعرے لگا رہے تھے اور **G4S** کے سیکوریٹی اہلکار انھیں دھکے مار رہے تھے۔

میں پروگرام کے اختتام کے بعد روم نہیں گیا، مجھے ڈر تھا کہ نوین پھر مجھے آڑے ہاتھوں لے گا، پوچھے گا:

''—— ڈیوڈ! کیوں گیا تھا وہاں، کیا لینے گیا تھا وہاں، کیا یہ لینے گیا تھا کہ شری مان وی سی جے این یو کے لیے کوئی گوڈ نیوز سنائیں گے یا تحفہ دیں گے؟ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو وی سی کے ارادوں سے واقف نہیں ہے، یا ممکن ہے تُو بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے گیا ہو۔''

میں نے اس طرح سے اس دن نوین کی باتوں کو شکست دے دی، وہ شاید اس دن خود ہی اپنا گلہ گھونٹ کررہ گئی ہوں گی۔ نوین کی متوقع باتوں میں سچائی تھی اور اس کے طنز، روح تک اثر کرنے والے تھے۔ واقعی وی سی کو ہم جے این یو والے اس طرح نہیں سمجھ سکے جیسا سمجھنا چاہیے تھا، پھر اسی ناسمجھی کے سبب کہیں کہیں ہم ان کی حمایت بھی کررہے تھے۔ اس کی تقریبات میں شریک ہوکر ان کے ارادوں اور فکروں کی تائید کررہے تھے۔ ایک ایسا شخص جس نے جے این یو کو یرغمال بنالیا ہو، اس کی حمایت و معاونت واقعی بوالعجبی تھی جس کا احساس ہمیں بہت دیر میں ہوا۔

www.urduchannel.in



○○○

اسکولنگ لوک ڈاؤن اب بیسویں دن میں داخل ہوگئی۔ پڑھائی بالکل ٹھپ اور آفیشیل ورک بالکل جام ہوکر رہ گئے۔ نان ٹیچنگ اسٹاف کے لوگ ہر دن آتا اور باہر سے چلے جاتے۔ وہ ہاتھ بھی ملتے اور پیشانی پر آنے والا پسینہ بھی پوچھتے۔ گھروں سے لائے ہوئے ٹفن لٹکا و بیگس لٹکائے لٹکائے اِدھر اُدھر پھرتے رہتے۔ کوئی ان سے پوچھتا، کیسے حالات ہیں، وہ افسردگی سے مسکرا کر رہ جاتے۔ جے این یو ان دنوں بہت ہی مشکل حالات اور اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہا تھا اور ہر نیا آنے والا دن اس کے لیے ہوشربا خبریں لے کر آرہا تھا۔ جے این یو کبھی کبھی تو یہ سوچ کر ہی ہلکان ہوجاتا ہے اس کی ذات اور ہستی پر ہونے والا اگلا حملہ کتنی شدت سے ہوگا اور اس کی عظمت کے کتنے کنگورے گریں گے۔ ترقی پذیر دلّی میں جے این یو الگ تھلگ پڑ گیا، دہلی کے پاش علاقے میں واقع ہونے کا بھی اسے فائدہ نہیں ملا۔ اس کی حیثیت اس بیٹی کی سی ہوگئی جو اکلوتی ہو مگر ناکارہ باپ اور خودغرض ماں کے ناروا سلوک کے سبب تمام خوشیوں، آسائشوں اور مسرتوں سے محروم ہوجائے، پھر اس سے ذرا سا غلط سلوک کیا جائے تو وہ ہتھے سے اکھڑ جاتی ہے، پھر اپنی بھڑاس نکالتے وقت وہ نہ یہ دیکھتی ہے کہ اس کے سامنے ماں ہے یا باپ یا پھر کوئی اور۔ اس وقت اس کی حالت بھی ایسی ہوتی ہے جیسے وہ اپنے مخالفین کے نرغے میں پھنس کر ان سے جان بچانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی ہو۔ جے این یو کی صورت حال بالکل یہی ہے۔ وہ ساؤتھ ویسٹ دلّی کے شاندار اور بہار زار علاقے میں بے بسی اور کسمپرسی کی حالت میں دن دن رات رات کررہا ہے۔ جے این یو بے سہارا ہوکر خود ہی اپنے مردہ یا شکستہ وجود کو ہی سہارا بنا رہا ہے۔ وائے جے این یو، ہائے جے این یو، تیرا سورج کیوں گرہن ہوا اور اب اس اندھیرے میں سحر کی کرنیں کب پھوٹیں گی۔

○○○

## (11)

## —— *OPEN ... OPEN JNU*

آج 9 اپریل کو ایک مہینے بعد اسکولس کھلے، میں اتنے شوق سے دیکھنے گیا جیسے بچپن میں گلی میں کسی تماشا دکھانے والے کے آنے وقت کودتے پھاندتے، بھاگ کر جاتا تھا۔ اسکول کا کھلا مین گیٹ دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنی باہیں کشادہ کردی ہوں اور دراز کیے ہوئے ہاتھوں سے بچوں کو بلا رہا ہو جو ایک مہینے سے اس سے دور تھے اور اس کی آنکھوں سے اوجھل۔ باہیں کھولے زبان حال سے اسکولس کہہ رہے تھے:

''—— مت ڈرو، بالکل بھی پریشان مت ہوؤ، میں کھلا ہوا ہوں، میں اب بند نہیں ہوں، تم دیکھو نا میرے دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ مجھے پتا ہے تم ہر روز آتے تھے اور مجھے لوک ڈاؤن دیکھ کر واپس لوٹ جاتے تھے، اس وقت جو تمھاری حالت ہوتی ہوگی، اس سے کم میری نہیں ہوتی تھی۔ میرے بھی دل کے کسی گوشے میں یہ درد و کرب جا کر جمع ہو جاتا تھا جس سے میں پل پل کراہتا رہا ہوں۔ مگر اب میں کھل گیا ہوں، ڈرو مت، میرے پاس آجاؤ، مجھ سے بھاگو مت، آؤ میری بانہوں میں سما جاؤ میرے پیارے بچو۔ مجھے تسکین بخشو، اپنی گرم سانسوں سے میرے سرد وجود کو گرما دو——''

یہ میرا ہی جنون نہیں تھا، اکثر بچے اسی عالم میں اسکولس کے دیدار کو آئے اور انھوں نے

www.urduchannel.in



ان کی آوازیں، اپنے اپنے طور پر سنیں۔ اپنے اپنے طریقوں پر محسوس کیں۔

اس دن کے بعد سے اسٹوڈینٹ پورے کیمپس میں **OPEN .... OPEN JNU** کا نعرہ لگاتے پھر رہے تھے۔ مگر مجھے اب نوین کے انداز میں لگ رہا تھا کہ یہ اسکول اوپننگ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی۔

یہ اوپننگ لونگ ٹائم کے لیے تھی یا شارٹ ٹائم کے لیے؟ ان سوالوں سے پرہٹ کر یہ بات بھی اہم تھیں کہ اسکولس کے دروازے کھلنے سے کس کی جیت ہوئی اور کس کی ہار، کس کا فائدہ ہوا اور کس کا نقصان، کس کی مراد بر آئی اور کس کو منہ کی کھانی پڑی، کون سرینڈر ہوا اور کس کا حکم چل گیا۔ میں اس معاملے پر جتنا سوچتا گیا الجھتا ہی گیا۔ اس ڈور کی مانند جسے جیری نے ٹام کے مظالم سے تنگ آ کر اس کی بے خبری میں دم سے باندھ کر فرنیچر، کچن، بیڈروم، اسٹور، واسموک اکژہاسٹ پائپ سے لے کر بیک گارڈن کے ایک درخت سے باندھ دیا تھا پھر اسے بزر مار کر ہوشیار کیا تو وہ، اسی الجھی ڈور میں الجھتا ہوا گارڈن میں جا پڑا تھا۔ اسے پتا چلا تو اس کے سر میں چوٹ لگنے سے گولسیڑا نکل گیا تھا اور اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے ستارے ناچ رہے تھے۔ مگر یہاں کوئی ڈور نہیں تھی، یہ تو کچھ سوالات تھے، کچھ اندیشے تھے، کچھ ڈر تھے، کچھ اندازے تھے، کچھ معمے تھے جن کا حل ہونا بھی ضروری تھا اور نہ ہونا بھی۔ میں اسی الجھن کا شکار تھا۔ وہی ٹام جیری والا کھیل میرے احساس کی گلی میں کھیلا جا رہا تھا۔ جیری آگے بھاگ رہا تھا، ٹام شکلیں بگاڑتا، منہ بناتا، تیوریاں چڑھاتا، دکھاتا، اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ پھر جیری اسے ہاتھ سے روک کر آس پاس پڑی کوئی چیز اس کے سر پر مار کر اسے اس کے ارادوں سے باز رکھ رہا تھا۔ یہ کھیل احساس کی گلی سے نکل کر وجود کے میدان میں آ گیا۔ اب تو راجر ڈوگی بھی جیری کا ساتھ دے رہا تھا اور ٹام کی روح فنا ہو ہو جا رہی تھی۔ ایک جگہ اسے ہڈی مل گئی جو اس نے راجر کو پھینکی، راجر، ہڈی کا لالچی دوڑا گیا۔ اُدھر ایک جست لگا کر ٹام نے جیری کو پکڑ لیا اور اسے آنکھیں دکھانے لگا، اچانک اس کے سر پر راجر کا دو ہتھڑ اپڑا اور جیری اچھٹ کر دور جا پڑا...

''—— لسن پسی کیٹ، اٹس مائی فرینڈ....انڈر اسٹینڈ!'' راجر غراتی آواز میں کہہ رہا تھا اوراس کے کرخت ہاتھوں میں پھنسا ٹام اثبات میں سر ہلا رہا تھا، جیری اپنی اس حمایت اور تحفظ پر فاتحانہ قہقہے لگا رہا تھا، یہ الگ بات ہے کہ اس کے قہقہے ھاھا ھاھا...ھوھوھوھو کے بجائے ہی ہی ہی ہی....تھے! میں دیر تک اس کارٹون گیمس کو دیکھتا رہا جو میرے وجود کے میدان میں کھیلے جا رہے تھے۔ اچانک تیز اور فضا کو جھلساتی دھوپ میں کمی آتی چلی گئی۔ بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے سورج پر چھا گئے اور ہوائیں چل پڑیں۔ بارش کے آثار پوری طرح نمودار ہو چکے تھے۔ میں ٹام جیری کے کھیل کو چھوڑ کر جلدی سے چھت پر سوکھتے کپڑے اتارنے بھاگ گیا۔ یہ کھیل ابھی تک جاری تھا اور اب تک جیری زخمی ٹام کی چارہ گری کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد چھاجوں بارش ہونے لگے۔ جے این یو کے پہاڑی کیمپس کے لیے وہ بارش ایک نعمت ثابت ہوئی۔ اس سے پہلے بھی حالاں کہ بوندا باندی ہو چکی تھی، اس طرح اسے موسم کی دوسری بارش کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس بارش کا عالم، شباب، طرز، انداز، شگفتگی، آہنگ، ترنم، تبسم، شرارت، شوخی سب کچھ جدا تھی۔ یہ بارش جے این یو کے لیے کئی اعتبار سے مفید ثابت ہوئی۔

بہرحال موسم کی دوسری بارش کے دن جے این یو کی اسکولس کے دروازے کھل گئے اور چند ایک سینٹرس کو چھوڑ کر آفیشیل کام اسی انداز سے ہونے لگے۔ بہت سے دوستوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی کارکردگی کے بارے میں سوال و جواب ہوئے جن کا تبادلہ ملاقات کے بعد دوسرے نمبر پر لازماً کیا جاتا ہے....

''—— کیا چل رہا ہے....؟''

www.urduchannel.in



''—— کچھ خاص نہیں!''

''—— کتنا پڑھ لیا....؟''

''—— دو تین کتابیں، دو تین مضامین ...!''

''—— اور تم نے کیا کیا اب تک؟'' اب پوچھنے والے سے ہی سوالات۔

''—— میں نے بھی اتنا ہی کام کیا۔''

''—— اور اس کے علاوہ؟''

''—— اس کے علاوہ یہ کہ میں کچھ دن کے لیے کیمپس سے باہر چلا گیا تھا!''

''—— اچھا...اچھا کیوں؟''

اس کے بعد اس کیوں کے بہت سارے سوالات اور بہت سارے جوابات کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس طرح یہ ڈسکشنس کئی جگہ جاری ہو گئے۔

ایک جگہ کچھ لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں:

''—— ہائے نشا، لانگ ٹائم نو سی....؟''

''—— ہاں یار نیہا...ایکچوئلی آئی ایم گوئنگ ٹو مائی ہوم، وہ کیا تھا نا میری سسٹر کی شادی تھی۔''

نشا نے کہا:

''—— واؤ...کنگراچولیشنس!'' سب لڑکیوں نے تالیاں بجا کر نشا کو مبارک باد دی۔

''—— بائی داوے، لڑکا کرتا کیا ہے! آئی مین تمھارا جیجو راجہ''

''—— وہ نا شہر کی بیسٹ کمپنی میں جنرل منیجر ہے...

''—— ارے واہ، پھر تو پارٹی بنتی ہے...!''

''—— یا فکورس...''

''۔۔۔ تو پھر بتاؤ کہاں...؟''

''۔۔۔ کہاں یار، جسٹ مغل دربار...!''

''۔۔۔ ایکس کیوزمی! نو مغل دربار، جسٹ میزبان،'' دو تین لڑکیوں کے منہ بن گئے۔

''۔۔۔ بٹ وائے؟''

''۔۔۔ نووے! یار دیکھتے نہیں وہ وہاں ایک ہی ٹائپ کا ملتا ہے، میزبان از میزبان، اینڈ الٹی میٹ بیسٹ... نو آئل، نو فیٹ، بٹ آل دا بیسٹ'' ان ہی لڑکیوں نے تقریباً چہکتے ہوئے کہا۔

''اوکے....اوکے....مائی ڈیئرس..'' نشانے اتراتے ہوئے کہا۔

پتا نہیں وہ کیا بات تھی کہ ان میں دو لڑکیاں ہنسنے لگیں، ان کی نقرئی ہنسی کے غبارے پوری فضا کو دل نشیں آہنگ عطا کر رہے تھے۔''

OOO

ایسا محسوس ہو رہا تھا جے این یو کے کیمپس میں اترنے والی یہ بارش اپنے ساتھ بہت سے دکھوں اور غموں کو لے گئی۔ سب کچھ کتنا دھلا دھلا اور صاف صاف لگ رہا تھا جیسے سنڈرولا کی زندگی میں انقلاب آ گیا ہو اور غریب زادی سے شہزادی بن کر مقابلۂ حسن میں قسمت آزمائی کے لیے کنٹسٹ لابی میں پہنچ گئی ہو، اب اسٹیج پر سب کی نگاہیں اسی پر تھیں اور اس کا زرق برق لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ جے این یو بالکل بے بی سنڈرولا لگ رہا تھا، جس کی پیشانی پر افسوس وحسرت کی لکیریں مٹ کر بشاشت وخوشی کے ڈونگرے برس رہے ہوں۔ اس کے ماتھے پر چاند دمک رہے تھے اور ستارے ہالہ بنا کر اس کی تابانی بڑھا رہے تھے۔ کبھی پھولوں کی ایک نازک سی ڈالی لہراتی ہوئی اس کے رخ کو چھو جاتی اور کبھی شوخ ہوا

www.urduchannel.in



اس کی زلفیں بکھیر دیتی۔

OOO

اسکولس کے فرنٹ ڈور پر بے شمار پوسٹرس، سلوگنس پیپر، ہارڈ وائنگری اموجیز سے سجے کلرڈ ہارڈ اینڈ سافٹ کارڈ چسپاں تھے جن میں وی۔سی اور انتظامیہ کی مذمتیں، ان کے خلاف نعرے بازیاں، ان کی علامتیں میٹنگوں کی عکاسی اور نہ جانے کیا کیا الا بلا ڈرائیو کیا گیا تھا۔ ان کو غور سے دیکھنے سے، پس منظر میں ان تخلیق کاروں کی وی۔سی کے تئیں شدید نفرت اور اس نظام سے بغاوت صاف جھلکتی تھی۔ کسی کارڈ میں وی سی کو مودی سرکار کا چمچا بنا کر دکھا گیا، کسی میں اسے ٹینک چلاتے ہوئے دکھایا گیا۔ اس کے راستے میں جے این یو کی طرف ڈائریکشن اور اشاریے بنے تھے۔ ایک پوسٹر میں لال اینٹوں سے ایک دیوار بنائی گئی تھی جسے ایک طرف سے وی۔سی می ڈالا کچھ غنڈوں سمیت ہتھوڑا لے کر گرا رہا تھا اور دوسری طرف جے این یو کے طلبا ان اینٹوں کو اٹھا اٹھا کر پھر سے جوڑ رہے تھے۔ اس پوسٹر پر اوپر لکھا تھا۔''**کوشش تمھاری جاری ہے۔۔۔ جے این یو تم پر بھاری ہے**''۔

کسی میں **EC** یا **HLEC** کی میٹنگس، برش کے ذریعے اتاری گئیں تھیں۔ ایک پوسٹر دیکھا جس میں ایک طرف وی۔سی کی سہمی ہوئی کلوزپ ہے اور اوپر کی جانب سے س کے سر پر اردو ہندی، تمل، کنڑا، اڑیہ، راجستھانی سمیت بیرون ملکی زبانیں، سوال بن کر گر رہی تھیں۔ ان سب زبانوں میں پوچھا گیا تھا، کہ وی۔سی مہاراج یہ جے این یو کے ساتھ کیوں اور کیا کیا ہے؟ کس کے اشارے اور کس کے حکم کی تکمیل جے این یو میں کی جا رہی ہے؟ ان سوالوں کا جواب دینے کے بجائے وی۔سی مہاراج ان سے اپنی جان بچا رہے ہیں۔ میں دیر تک اس پوسٹر کا کئی پہلوؤں سے جائزہ لیتا رہا اور دانتوں تلے انگلی دباتا رہا اور پوسٹر کے

تخلیق کاروں کو داد دیتا رہا۔

○○○

سال **2018** کے سالانہ امتحانات اب بالکل سر پر آ چکے تھے۔ محض **12** دن بعد سال بھر کی پڑھائی کا احتساب ہونا تھا۔ ایم اے اور بی اے کا کورس مکمل کرنے والے بچے پریشان تھے، مگر اب وہ ان ہی دنوں کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تیاریوں میں لگ گئے۔ جے این یو سست روی سے پھر ری کوری کرنے لگا اور اس کے تعلیمی ماحول پھر سے عود کر لگا۔ جیسے وقت پلٹتا ہے اور پھر پوری رُت ہی بدل جاتی ہے۔ جے این یو انتظامیہ کے تیور اور رویے بھی درست درست، نرم نرم، شفیق شفیق ہونے لگے۔ جے این یو کی فضا اور ماحول کی سسکیاں بھی اب دل فریب مسکان میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ جے این یو کے بہی خواہ یہی چاہ رہے تھے۔ یہی ہو بھی رہا تھا۔ یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ انسٹی ٹیوٹ اسی لیے بنا تھا اور اس کے یہی وسیع تر مقاصد تھے۔ جے این یو کا وجود اسی خوبی کے سبب دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی حسن نے اس کی جانب دنیا کی توجہات مبذول کی ہیں۔

ایسا لگتا تھا کہ احتجاجی طلبا نے جے این یو کے مفاد اور تحفظ کے نقطۂ نظر سے مفاہمت کی راہ اختیار کر لی تھی۔ یہ وقت کی آواز اور نوشتۂ دیوار بھی تھا۔ ورنہ اس سے **VC** اور اس کے ہم نواؤں کا وہ خواب پورا ہو جاتا۔ جو وہ پہلے ہی دن سے آنکھوں اور خیالوں میں سجا کر آئے تھے۔ اس دوہری کیفیت سے نبٹنا ہم ہی جانتے ہیں۔ ہم نے اسے اپنے جسموں اور اپنے وجود پر جھیلا اور **JNUVC** کے غلط ارادوں کو حقیقت کا روپ نہ لینے دیا۔

○○○

گزرے دنوں میں جے این یو جو کچھ گنوا چکا تھا، اس کی واپسی تو ناممکن تھی مگر اس کے

www.urduchannel.in



پاس جو کچھ بچا تھا اب اسے ہی سنبھال کر رکھنا اور اسے فروغ دینا ہی اس کی اولین، ثانوی اور آخرین ترجیحات میں شامل ہو گیا۔ جے این یو کسی بھی لمحے غفلت سے کام لینا نہیں چاہتا تھا، مبادا یہ کہ اس کی رہی سہی شان بھی جاتی رہے اور جے این یو تاریخ کا حصہ بن جائے۔ پھر نئی نسلوں کو کوئی بتانے والا بتائے کہ دہلی شہر میں ایک جے این یو تھا... اور وہ نسلیں کہیں، پھر کیا ہوا؟ کہنے والا پھر اس کی داستان بربادی سنانا شروع کر دے... اور سننے والی نسلیں چہ چہ کر کے رہ جائیں۔ ان دنوں جے این یو ضرورت سے زیادہ حساس ہو گیا۔ اب ہلکی سے چوٹ پر بھی وہ بلبلا اٹھتا تھا۔

○○○

اسکول اوپنگ کی خوشی میں ایک جلوس نکلا، جسے ''جے این یو وکٹری مارچ'' کا نام دیا گیا۔ مارچ کی گلیاں/راستے وہی تھے، یعنی گنگا ڈھابہ ٹو چندبھاگا ہاسٹل۔ میں بھی اس میں شامل ہوا اور خوب جے این یو کی لبرٹی کی لانگ لونگ کے لیے نعرے لگائے۔ اس جلوس سے فارغ ہو کر میں خوشی خوشی روم نمبر 259 آیا اور نوین کو چھیڑنے کے لیے اس کی بچی کھچی سانسوں سے پرجوش انداز میں بولنے لگا۔

''—— ڈوڈ! دیکھ جے این یو شٹ ڈاؤن ہونے سے بچ گیا، تمھاری سب باتیں جھوٹی، سب غلط، تم بکواس کرتے تھے۔ دیکھ جے این یو واپسی کر رہا ہے۔ جے این یو کی بہاریں لوٹ رہی ہیں، جے این یو کا جوبن کھل رہا ہے اور اس کے حسن کی آب و تاب بڑھ رہی ہے۔''

میری امیدوں کے برخلاف نوین نے میری ان باتوں پر ایسا ہی ری ایکٹ کیا جیسا وہ پہلے بھی کیا کرتا تھا۔ اس کا پھر وہی قہقہے لگانا، وہی ہنسنا، نے پھر وہی باتیں کیں، اس کا پھر

وہی انداز تھا۔اس کی وہی دلیلیں اور اندیشے تھے۔اس کی وہی باتیں تھیں اور وہی سسکیاں، کبھی ان میں تیزی، کبھی سستی۔

گو یہ باتیں میرے لیے اجنبی نہیں تھیں، مگر اس ماحول میں تو انھوں نے مجھے چکر کھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ نفسیاتی اثر تھا جسے میں برداشت نہ کر سکا بالآخر ان میں الجھ گیا۔ مجھے پھر ٹام بیک گارڈ میں پڑا ہوا دکھائی دیا جس کے سر کے ارد گرد ستارے ناچ رہے تھے اور سر پر لال گلسیڑا انکل گیا تھا۔ دفعتاً وہ ستارے میرے سر کے ارد گرد ناچنے لگے، مجھے بھی ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر بھی ڈنڈا مارا ہے اور گلسیڑ انکل کر سر سے بلند ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ہوش سے بے ہوشی اور شعور سے مدہوشی کیفیت میں پہنچوں، سر پکڑ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ میری ادھ کھلی آنکھوں سے ایک کائنات گزرتی جا رہی تھی۔ جے این یو کے خوب صورت دنوں کے قافلوں چلے جا رہے تھے، خوب صورت ورشک جناں تھرکتے وجود، غزال آنکھیں، مٹکتے ابرو اور غزل چہرے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو میرے دل میں بسے تھے اور کچھ کا تصور ہی روح کو سکون بخشتا تھا۔ سب ہی گزرتے جا رہے تھے۔ اس تیزی سے جا رہے تھے جیسے انھیں وہاں سے فوراً طور نکل جانے کے احکامات دے دیے گئے ہوں۔ بہاریں، رُتیں سب لُٹ رہے تھے، سب برباد ہو رہے تھ۔ اپنا سامان اٹھائے بدحواسی کے عالم میں بھاگے جا رہے تھے۔ اور اب میرے سامنے وہی جے این یو تھا جس کا نقشہ ایک بار نوین نے کھینچا تھا۔

''—— جے این یو برباد ہو گیا، جے این یو بدل گیا، جے این یو میں سیکولرزم اور بھائی چارے کی گائے ذبح ہو گئی اور اس فرشتے کو گولی مار دی گئی جو یہاں امن کا پیامبر تھا۔ تف ہے تم پر اگر تم نے نجیب کا دردناک واقعہ اور حادثہ دیکھ کر بھی جے این یو کی بربادی اور اس کی

www.urduchannel.in



قدروں کی پامالی کا اندازہ نہیں کیا تو! اتنے سارے حالات رونما ہونے کے باوجود بھی اگر تم جے این یو کے اس سینس میں دیکھتے ہو، جو اس کی اصل بنیاد تھے، تو تم سے بڑا کور چشم کوئی اور نہیں ہو سکتا.....''

ایسے ہی اس نے کہا تھا:

''—— انیس! وہ دن بہت دور نہیں جب جے این یو بھگوا رنگ سے رنگ دیا جائے گا اور یہاں ملک کے حق و انصاف کی باتیں ہونے کے بجائے فاشزم اور فسطائیت کو بڑھاوا ملے گا۔ یہاں اس کے پرچار ہوں گے۔ ملک کے اکثریتی طبقے کی شر پسندیوں کے لیے یہاں خام مال تیار ہوگا۔ یہاں ملک میں دنگا، فساد اور ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کو ختم کرنے کے منصوبے بنیں گے۔ یہاں شاکھائیں بنیں گے اور ان میں بھارت ماتا کے تحفظ کے لیے مسلمانوں اور اقلیتوں کا خون بہانے کے سنکلپ لیے جائیں گے۔ اپنی اس کارروائی بھارت ماتا کے یہ نام نہاد بھکت بھارت ماتا کے ہت میں کہیں گے، وقت اور ماحول بھی ان کا ساتھ دے گا جس کے بعد انھیں کھلی شر پسندی کا سرٹیفکٹ مل جائے گا، تم دیکھنا——''

مجھے اس کی اور بھی باتیں آتی رہیں۔ چشم نم مسکراتی رہی....

○○○